قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریّا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدّین اکبر

ناشر: عطاءُ الرحمٰن آرائیں

طابع: سیّد عبدالسلیم

مطبع: آفتاب عالم پریس

۱۳، ہسپتال روڈ۔ لاہور

فون۔ ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۶ — جنوری ۱۹۹۳ء — شمارہ ۱

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: -/۱۰ روپے

فہرست مضامین

لمعات ——— ادارہ ——— ۲

گذارش ——— ادارہ ——— ۹

ہندو کیا ہے ——— علامہ غلام احمد پرویزؒ ——— ۱۰

اسلامی ماہ و سال ——— عبداللہ شانی ——— ۳۵

حقائق و عبر ——— ادارہ ——— ۴۱

بابری مسجد ——— غلام رسول ازہر ——— ۴۳

نقد و نظر ——— ادارہ ——— ۴۴

اقبال کا شکوہ ——— کرامت اللہ خاں ——— ۴۸

رستا ناسور ——— صاحبزادہ سیّد خورشید گیلانی ——— ۵۰

بابری مسجد ——— محمد قاسم نوری ——— ۶۰

مرزا محمد خلیل ——— ادارہ ——— ۶۱

مکتوب از ناروے ——— عبدالحمید ——— ۶۳

بابری مسجد ——— حنیف وجدانی ——— ۶۶

بچوں کے صفحات ——— غلام احمد پرویزؒ ——— ۶۷

سو سوالوں کا ایک جواب ——— ادارہ ——— ۷۰

71 Shamim Anwar Unforgettable

72 Parwez (r) Beauties of Life

79 Dr. Mahathir ISTAC opening

80 Idara Darse-e-Quran

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۔ لمحۂ فکریہ

مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی کا قیامت خیز و روح فرسا حادثہ آیا اور گذر گیا۔ اُن دو چار دنوں میں، اخبارات کی شہ سرخیوں سے ایسا نظر آتا تھا کہ اب اسرائیل کی مملکت ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے یہودی، بس چند ہی دن کے مہمان ہیں۔ ساٹھ ستر کروڑ مسلمانوں کا بحرِ ذخار، بے پناہ طغیانیوں کے ساتھ تلاطم خیز ہوگا اور انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا اور اس کے بعد اس غاصب اور ظالم قوم کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ جائیں گے۔ آتشناک مضامین لکھے گئے، شعلہ بار تقریریں ہوئیں، ولولہ انگیز نظمیں پڑھی گئیں، زلزلہ خیز ریزولیوشن پاس ہوئے اور اس کے بعد، قوم پھر حسبِ معمول اپنے معمولات میں مصروف ہوگئی۔ زیادہ سے زیادہ ہوا یہ کہ اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ یہ المیہ کشمیر کے مصرعۂ اوّل کا مصرعۂ ثانی بن سکے اور یوں اس "حسین و سادہ و رنگیں" بیت کی تکمیل ہو جائے۔

ہندوؤں نے سومنات کی جامع مسجد کو، جو ایک ہزار سال سے وہاں ایستادہ تھی، مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنا دیا۔ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ اس روز قوم میں جس قدر لڑکے پیدا ہوں ان کا نام محمود رکھا جائے۔ یہ کچھ کر لیا اور ہم خاموش ہو گئے کہ ہماری قوم میں اتنے محمود پیدا ہو گئے ہیں اور اس کے بعد جو وہاں مسجدیں ڈھانے کی طرح پڑی ہے تو پھر ایسے واقعات کا کوئی انت شمار ہی نہیں رہا۔ بابری مسجد کا سانحہ اور اس حوالہ سے مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر قتلِ عام بھی اسی سلسلۂ دراز کی ایک کڑی ہے اور ہمارا ردِّ عمل یہاں بھی پہلے ردِّ عمل سے مختلف نہیں۔ حالانکہ صورت حال اب یہ ہے کہ

ہندوستان میں ضعیف و ناتوان، مظلوم و مقہور مسلمانوں کی قتل و غارت گری کا مسئلہ اب انتہائی شدت تک

پہنچ چکا ہے۔ اس چوالیس سال کے عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں "فرقہ وارانہ فسادات" ہو چکے ہیں۔ "فرقہ وارانہ فساد" کی اصطلاح وہاں کے ہندوؤں نے جان بوجھ کر وضع کر رکھی ہے تاکہ دنیا کے سامنے حقیقت نہ آنے پائے ورنہ جسے وہ فرقہ وارانہ فساد کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ دراصل مسلمانوں کے کشت وخون اور ان کے اتلافِ جان و مال اور بربادیٔ عصمت و آبرو کے جگر پاش اور دلخراش مناظر ہوتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کی ان چیرہ دستیوں کو بزورِ روک نہیں سکتے اور مظلوم مسلمانوں کی کچھ مدد بھی نہیں کر سکتے۔ بین الاقوامی اداروں میں، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے۔ اس لئے کمزور اور مظلوم کی وہاں بھی داد فریاد نہیں۔ سوال یہ ہے ان حالات میں، ان بچاروں کی جانیں بچانے کے لئے کیا کیا جائے۔ اس کے متعلق ہم آج بھی وہی کچھ کہیں گے جو کچھ ہم نے ابتدائی فسادات کے زمانے میں کہا تھا۔ یعنی یہ کہ حکومت کی سطح پر بین الاقوامی آئین وضوابط کے مطابق تبادلۂ آبادی کا انتظام کیا جائے، وہاں کے مسلمانوں کو بحفاظت ادھر منتقل کیا جائے اور ان کی تعداد کی نسبت سے ہندوستان کا اتنا رقبہ پاکستان میں شامل کر لیا جائے۔ باقی رہی ان غیر منقولہ جائیداد، سو اس کا تصفیہ ایک اعلیٰ سطح کے کمیشن کی زیرِ نگرانی کر لیا جائے۔ اس کے سوا نہ وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کی کوئی اور تدبیر ہو سکتی ہے نہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات میں خوشگواری پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے کشمیر کا لاینحل مسئلہ بھی نہایت عمدگی سے حل ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اسی کا نام ہجرت ہے۔ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ جس علاقہ میں اسلامی نظام نافذ ہو چکا ہو یا جہاں اس کے قیام کے امکانات زیادہ روشن ہوں، دوسرے علاقوں کے مسلمان وہاں منتقل ہو جائیں۔ پاکستان میں سردست اسلامی نظام قائم نہیں ہوا لیکن چونکہ اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا ہے اس لئے یہاں اس نظام کے قیام کے امکانات یقینی ہیں۔ اگر اس بلند سطح سے نیچے اُتر کر بھی دیکھا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو، ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان میں بہرحال محفوظ رہے گی۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے، تو ان بے چاروں کا اِدھر منتقل ہو جانا، انہیں تباہ کن خطرات سے محفوظ کر لے گا۔ دیگر ممالک میں اس قسم کی تبادلۂ آبادی کی مثالیں موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمانوں نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ تقسیم کا مسئلہ بڑی افراتفری میں طے ہوا۔ اگر یہ لوگ یوں مخالفت نہ کرتے، تو تمام متعلقہ مسائل سکون و اطمینان کی فضا میں طے پاتے۔ اس صورت میں پاکستان کی شکل کچھ اور ہوتی اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا مسئلہ بھی خوشگواری کے ساتھ حل ہو جاتا۔ اس کے لئے تبادلۂ آبادی اور حصولِ رقبہ ہی بہترین صورت تھی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ گذشتہ چوالیس برس میں ہوا ہے اور جو کچھ وہاں اب ہو رہا ہے اسے بین الاقوامی سطح پر سامنے لایا جائے اور تبادلۂ آبادی اور رقبہ کی تجویز کو بطور حل پیش کیا جائے، اس میں مشکلات ضرور نظر آتی ہیں لیکن

جس شدت سے وہاں خونِ مسلم کی ارزانی ہو رہی ہے اس کے مقابلہ میں ان مشکلات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کی حفاظت تو ہمیں اپنی جانیں دے کر بھی کرنی پڑے تو یہ سودا مہنگا نہیں پڑے گا۔ اگر حالات ایسے ہی رہے تو پھر جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ایسا ہی وہ نازک وقت تھا جب قرآن کریم نے مدینہ کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵)

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں جنگ کے لئے باہر نہیں نکلتے۔ حالاں کہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آ کر فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو کارساز بنا دے اور کسی کو ہماری مدد کے لئے کھڑا کر دے۔

کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اس سے پہلے ہی ان مظلوموں کو ان وحشی درندوں کے چنگل سے نکال لائیں۔ ان کے لئے (قرآن کے الفاظ میں) خدا کی زمین کو وسیع کر دیں تاکہ وہ اپنے آپ کو حفاظت کے مقام تک پہنچانے کے قابل ہو جائیں۔ اس کے بعد جو مسلمان اُدھر ہی رہنا چاہیں ان کی کوئی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہو گی۔ لیکن جو اِدھر آنے کے لئے بیتاب ہیں انہیں ادھر منتقل کرنے کا انتظام ہمیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہمارا فریضہ ہے اور اس کے علاوہ اس مشکل کا حل کوئی نہیں۔

۲۔ بات آگے کیوں نہیں بڑھتی؟

آجکل ہمارا معاشرہ جس قسم کے خلفشار کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی مثال کم ملے گی۔ اس کی وجہ کیا ہے، یہ تھوڑے سے غور و تدبر کے بعد سمجھ میں آجائے گی۔ معاشرہ میں جو خاص الفاظ یا اصطلاحات بالعموم استعمال ہوتی ہیں، اگر ان کے معانی اور مفہوم متعین ہوں تو ذہنی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ الفاظ اور اصطلاحات تو بارش کی طرح برس رہے ہوں اور ان کے نہ معانی متعین ہوں نہ مفہوم، تو انتشار، جھکڑ اور اولوں کی شکل اختیار کر لیگا اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ قوم بھنور میں گھری ہوئی لکڑی کی طرح مسلسل حرکت میں دکھائی دے گی لیکن آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھے گی۔

حل کے لیے ان چند ایک الفاظ و اصطلاحات پر غور کیجئے جو ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر ہیں اور سوچئے کیا ان کا کوئی متفق علیہ متعین مفہوم بھی ہمارے ذہن میں ہے ؟

ا۔ اسلام

آجکل سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ یا اصطلاح اسلام ہے۔ وہ کون سا عقیدہ، نظریہ، مسلک، نظام، پروگرام ہے جس کے ساتھ "اسلامی" کا لاحقہ نہیں لگا دیا جاتا۔ لیکن آپ "اسلامی" کہنے والے کسی دو (عوام الناس نہیں، خواص سے پوچھ کر دیکھئے۔ یا تو اس کا کوئی متعین مفہوم ہی ان کے ذہن میں نہیں ہوگا اور یا ان کا مفہوم ایک دوسرے سے نہیں ملے گا۔ ان کے پیشِ نظر کوئی ایسا معیار ہی نہیں ہوگا جس سے اسلامی اور غیر اسلامی میں پرکھ یا تمیز ہو سکے۔ جب ان دو کی یہ کیفیت ہے، تو سات کروڑ میں جو ذہنی تشتت ہوگا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے اس بنیادی سقم کو چھپانے کے لئے ایک اور اصطلاح عام کر رکھی ہے۔ یعنی

۲۔ کتاب وسنّت

کتاب تو ایک متعین کتاب ہے۔ یعنی قرآنِ مجید۔ لیکن سنّت کی اصطلاح جس قدر مقدس ہے اتنا ہی اس کا مفہوم غیر متعین ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ہر حدیث سنّت ہے لیکن دوسروں کے نزدیک سنّت سے مراد حضورؐ کے صرف وہ اعمال ہیں جو آپؐ نے بہ حیثیت رسولؐ التزاماً سر انجام دیئے تھے۔ (سنّت کی یہ تعریف مودودی مرحوم کی ہے)۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ لاکھوں کی تعداد میں ہے اور ان کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتّٰی کہ بخاری اور مسلم کا مجموعہ بھی نہیں۔ سنّت کے متعلق دشواری اس سے بھی زیادہ ہے۔ حدیث کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جس میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہو کہ حضورؐ نے فلاں کام بہ حیثیتِ رسولؐ التزاماً کیا تھا اور فلاں کام شہری حیثیت سے۔ لہٰذا سنّت کا بھی کوئی متفق علیہ مجموعہ اُمّت کے پاس نہیں۔ مودودی مرحوم نے کہا تھا کہ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے اور جماعتِ اہلِ حدیث کے امیر (مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم) نے ایسے دعویٰ کو باطل قرار دیا تھا۔

کتاب وسنّت کی اصطلاح میں یہ بھی طے نہیں کہ ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے؟ نظری طور پر تو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی حیثیت بہرحال فائق ہے لیکن عملاً حدیث کو قرآن پر قاضی قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی جب کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ ہو، تو فیصلہ حدیث کے مطابق ہوگا۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

پاکستان میں اسلامی قوانین سازی کی بنیادی ذمہ داری اسلامی نظریاتی کونسل کی ہے اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے شعبہ (یا وزارتِ) قانون (LAW MINISTRY) کی۔ آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ نہ نظریاتی کونسل کے پاس اور نہ ہی وزارتِ قانون کے پاس "سنّت" کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتّٰی کہ وفاقی شرعی عدالت یا سپریم کورٹ کے پاس بھی نہیں۔ اس کے باوجود ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ تمام امور کے فیصلے "کتاب وسنّت" کے مطابق کریں؛ یہ بات تعجب انگیز ہے یا نہیں؟

اس کا حل انہوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ

۳۔ فقہ کے قوانین

نافذ کردیئے جائیں۔ ہمارے مختلف فرقوں کی مختلف فقہیں ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ اپنی فقہ کو کتاب وسنّت کے مطابق قرار دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس کا مطلب یہ ہے کہ "کتاب وسنّت" ایک ایسا سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے قوانین مل سکتے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ اہل حدیث حضرات سرے سے کسی فقہ کے ہی قائل نہیں۔

یہ ہیں وہ حقائق جن سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ اس کے باوجود دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ ان قوانین کا حشر کیا ہوگا۔ اس کی مثالیں ابھی سے ہمارے سامنے آرہی ہیں۔ مرکزی حکومت (زکوٰۃ) سے متعلق) ایک پبلک لا نافذ کرتی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج ہوتا ہے تو قانون کو تبدیل کیا جاتا ہے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس فریضہ کو ادا کرلے۔ ان میں سے ہر ایک کا عمل اسلامی تسلیم

یا مثلاً مرکزی حکومت، نظریاتی کونسل اور وزارتِ قانون کی تصویب کے بعد [redacted] قانون (رجم) نافذ کرتی ہے۔ اسی حکومت کی وفاقی شرعی عدالت اس قانون کو اسلام کے منافی قرار [redacted] ..... اور ارادہ رکھتی ہے کہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردے۔ اب معلوم نہیں سپریم کورٹ کس کے فیصلے کو "کتاب وسنّت" کے مطابق قرار دے!

اس خلفشار کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ کسی نے "اسلامی" یا غیر اسلامی ہونے کا معیار یا "کتاب وسنّت" کا متفقہ مفہوم متعین نہیں کیا، نہ ہی کسی ایسے ضابطہ کی نشاندہی کی ہے جس میں یہ معیار متفق علیہ طور پر موجود ومحفوظ ہو۔ جن قوانین کے متعلق یہ کچھ ہو رہا ہے ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کی خلاف ورزی سے دنیاوی عدالتوں کی طرف سے سزا تو ملے گی ہی، انہیں خدا اور رسولؐ کے احکام قرار دے دیا جاتا ہے اس لئے ان کی معصیت سے آخرت میں بھی سزائے جہنّم ملے گی۔ سوچئے کہ جن قوانین کا تعلق اُمّت کے ایمان اور آخرت کی زندگی سے ہو، کیا ان کی کیفیت ایسی ہی ہونی چاہیئے؟

اسلامی قوانین سے آگے بڑھیے تو

نظریۂ پاکستان

کی باری آتی ہے۔ تشکیل پاکستان سے لے کر آج تک جتنی بار اس اصلاح کو دہرایا گیا ہے اس کی تعداد حد و شمار سے باہر ہے لیکن کیا آپ نے کسی کی زبان سے آج تک سُنا ہے کہ یہ نظریہ ہے کیا اور اس کا متعیّن مفہوم کیا ہے؟ پہلے تو یہ ایک نظری سوال تھا لیکن اب کہا جاتا ہے کہ اس نظریہ کی مخالفت کرنے والوں کو مملکت کا غدّار تصوّر کیا جائے گا۔ یہ بجا ہے۔ اسے ایسا ہی تصوّر کیا جانا چاہیئے۔ لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ پہلے یہ بتایا جائے کہ نظریۂ پاکستان ہے کیا؟ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ کسی نے اس کی مخالفت کی ہے یا نہیں؟ یہ تو قانون کا ابتدائی تقاضا ہے جس کا پورا کیا جانا نہایت ضروری ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو ملّتِ پاکستانیہ کے سامنے ہیں اور ان کے موجود ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ نظریۂ پاکستان کے سوا ان سب کا تعلّق براہِ راست ہماری مذہبی پیشوائیت سے ہے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں لیکن اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے وہ ٹیکنیک یہ اختیار کرتے ہیں کہ جونہی کسی نے اس قسم کا کوئی سوال اٹھایا، تو شور مچا دیا کہ یہ ملحد ہیں، بے دین ہیں، منکرِ حدیث ہیں، مغرب زدہ ہیں، سیکولرازم کے حامی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ نعرے اس زور و شور سے بلند کئے کہ وہ سوال اس شور میں دب کر رہ گیا اور یہ حضرات مطمئن ہو گئے کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔

سوال یہ نہیں کہ ایسا کہنے والے کیا ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا جانا ضروری نہیں؟ کیا یہ بتانا ضروری نہیں کہ:

۱۔ کسی عقیدہ، نظریہ، مسلک یا قانون کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا متعیّن یا متفق علیہ معیار کیا ہے؟

۲۔ کیا اس کی وضاحت ضروری نہیں کہ سنّتِ نبوی (علیہ التحیۃ والسّلام) کا متعیّن مفہوم کیا ہے اور وہ کونسی کتاب ہے جس میں یہ سنّت اس طرح محفوظ ہے کہ اسے سب سنّت تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ کیا یہ متفقہ طور پر طے کرنا ضروری نہیں کہ فقہی قوانین کی اپنی حیثیت کیا ہے اور آیا یہ ضروری ہے یا نہیں کہ شق ۱ کے مطابق انہیں بھی پرکھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ اسلامی ہونے کے معیار پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں؟

مذہبی پیشوائیت سے قطع نظر، ہم ملک کے اربابِ دانش و بینش اور پاکستان کے ہی خواہ طبقہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک ان امور کا متعیّن طور پر طے پا جانا ضروری ہے یا نہیں! اگر اسے وہ ضروری سمجھتے

ہیں تو کیا ان پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا کہ وہ آئینی اور قانونی طور پر اس کا مطالبہ کریں! اس وقت تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ملک میں قانون سازی کے معاملہ کو محض جذباتی طور پر ہاتھ میں لے لیا گیا ہے اور ان مبادیات تک کو حقائق کی روشنی میں طے ہی نہیں کیا گیا جو اس باب میں شرطِ اوّل اور لاینفک تقاضا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ قانون، قانون ہی نہیں کہلا سکتا جس کے مبادیات، تضمنات، حدود اور شرائط کو (DEFINE) اور متعین نہ کیا جائے۔

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ڈر ہے کہ موجودہ ذہنی خلفشار اور فکری انتشار مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گا۔ قوم کا نوجوان طبقہ اس صورتِ حال سے بُری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

آپ اقوامِ مغرب کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہاں سیکولرازم (جس میں مغربی نظامِ جمہوریت اور اشتراکیت دونوں شامل ہیں) لائی ہوئی ہی تھیاکریسی کی ہے۔ وہی تھیاکریسی اب یہاں بھی عام ہو رہی ہے، تو اس کا جو نتیجہ وہاں برآمد ہوا تھا وہی یہاں بھی برآمد نہیں ہوگا؟ تھیاکریسی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن قوانین کو مذہبی پیشوائیت، خدا کے احکام کہہ دے، انہیں جانچے، پرکھے بغیر، خدا کے احکام تسلیم کر کے ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ قرآنِ کریم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ نبیٔ اکرمؐ نے اسے شرک قرار دیا۔ مؤسسِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے اس سے محترز رہنے کی تاکید کی اور معمارِ پاکستان نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ پاکستان میں ایسا نظام نافذ نہیں ہوگا۔ اس کے تخریبی نتائج ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس خطۂ ارض کو اس تباہی سے محفوظ رکھے۔

ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا میں اسلام کہیں بھی نافذ العمل نہیں، اس لئے ہمیں کسی انقلاب، کسی نظام، کسی قانون کو اسلامی نہیں کہنا چاہیئے تاوقتیکہ وہ قرآنِ مجید کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے۔ ایسا کئے بغیر جب آپ کسی مملکت یا حکومت کو اسلامی کہتے ہیں تو اس سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے نہایت دکھے ہوئے دل کے ساتھ کہا تھا کہ

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو از درودِ خود میالا نامِ اوؐ

"جب تک تو اسوۂ محمدیؐ کو اپنی سیرت میں منعکس نہ کر لے حضورؐ پر درود مت بھیج کیونکہ اس طرح تیرے درود سے حضورؐ کا نامِ نامی آلودہ ہو جاتا ہے۔"

ہمارا قلب اگر حساس ہو تو ہمیں تو حضورؐ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیئے۔ اسلام کو جس قدر بدنام ہم نے کیا ہے، اسلام کے دشمنوں نے بھی ایسا نہیں کیا تھا۔

ز گلفروشِ تنالم کز اہلِ بازار است
تپاکِ گرمیٔ رفتارِ باغبانم سوخت

گذارش

قارئینِ محترم! سلام و رحمت

جیساکہ آپ کے علم میں ہے۔ طلوعِ اسلام ایک جریدہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے جس کا مقصد قرآنی فکر کو عام کرنا ہے۔

پرچے کا خریدار بن کر آپ نے قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں ہمارا ساتھ دیا ہے جس کے لئے ہم آپ کے تہہ دل سے ممنون ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ بھی اسے جاری رکھیں گے۔ تاہم اگر کسی وجہ سے آپ کے لئے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں حصّہ لینا ممکن نہ ہو تو براہِ کرم ہمیں مطلع فرما دیجئے تاکہ ہماری طرف سے آپ کو یاددہانی کے خطوط وصول کرنے کی زحمت نہ ہو۔

زرِ شرکت بدستور ۱۲۰/- روپے اندرونِ ملک اور ۴۰۰/- روپے بیرونِ ملک ہے۔ اللہ نگہبان

محمد لطیف چودھری
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

ہندو کیا ہے ــــــــ

جب ہم طاقت ور ہو جائیں گے تو مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھینگے

- قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔
- محمدؐ کو خدا کا نبی نہ مانو۔
- مکہّ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔
- سعدی اور رومی کی بجائے کبیر اور تلسی داس کو پڑھو۔
- اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔

سوامی ستیہ دیو

- ہندوستان کی ہر مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

پروفیسر رام دیو

اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

ہندو کیا ہے ——

پرویز

ہماری نئی نسل، جو یا تو تقسیمِ ہند کے وقت جھولوں میں تھی، اور یا اس کی پیدائش تشکیلِ پاکستان کے بعد ہوئی، اس اعتبار سے تو ایک گونہ خوش قسمت ہے کہ اسے ہندو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہی چیز قوم کے حق میں بڑی مضرت رساں ہے کہ اِس نژادِ نَو کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ اس باب میں ہمارے اربابِ حل و عقد اور اعیانِ دانش و بنیش نے بھی جو مجرمانہ تغافل برتا، فطرت اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے نہ تو ان نوجوانوں کی تعلیم کا کوئی ایسا انتظام کیا جس سے وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے کہ ایک الگ مملکت کا وجود کس طرح ہمارے دین کا بنیادی تقاضا اور بہ حیثیت قوم ہمارے زندہ رہنے کا واحد ذریعہ تھا —— یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں —— یا بہ حیثیت مسلم قوم باقی رہ سکیں۔ اور نہ ہی کوئی ایسی تاریخ مرتب کی گئی جس سے انہیں کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ ہندو کیا ہے اور کوئی شریف انسان اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کے دل میں ہندو کی طرف سے خواہ مخواہ جذبۂ نفرت اُبھارنا چاہتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہندو، ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجائے تاکہ یہ اُسے، اپنے جیسا انسان سمجھ کر، اس کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے کہ ؎

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

یعنی فقط میری حالت دیکھ کر خلقت کے دل سینوں میں پگھل گئے۔ جب انہیں معلوم ہو گا کہ میرا پالا کس سے پڑا ہے تو نہ معلوم ان پہ کیا گزرے؟

ہماری دشواری یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ہندو کے ساتھ کبھی پالا نہیں پڑا —— اور خدا کرے کہ ایسا کبھی

نہ ہو ـــــ اور نہ ہی ہم نے، جنہیں ان کے ساتھ مدتوں پالا پڑتا رہا، انہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کی ہے کہ ہندو کیا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان میں اچھے بھلے بستے رستے تھے، ان سے الگ ہو کر ہم نے خواہ مخواہ ایک مستقل خطرہ کیوں مول لے لیا؟ اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں کسی حد تک حق بجانب ہیں۔ حیوانات کے لئے آسانی یہ ہے کہ وہاں ہر نوع کی شکل و صورت جداگانہ ہوتی ہے جس سے انہیں ایک دوسرے کی پہچان میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کسی بکری کو اس میں مغالطہ نہیں لگ سکتا کہ جو جانور سامنے سے آ رہا ہے وہ درندہ شیر ہے یا بے ضرر ہرن۔ لیکن انسانوں کے معاملہ میں صورت یہ نہیں۔ یہاں انسانی پیکر سب ایک جیسے ہوتے ہیں، اس لئے اس باب میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ جو دوسرا انسان کھڑا ہے وہ رہزن ہے یا راہ نما۔ ہندوؤں کی شکل و صورت چونکہ انسانوں ہی جیسی ہے اس لئے ہمارے نوجوان انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جنہیں وہ (محض پیکروں کے دھوکے میں) انسان سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت کیسے کیسے خونخوار درندے، مہیب نہنگ و اژدر یا مکار لومڑیاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے سامنے ہندو کی ایک خفیف سی جھلک، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آئی تھی، لیکن ایک تو وہ حادثہ ہی برق کی چشمک یا شرار کی چمک سے زیادہ دیرپا نہیں تھا، دوسرے ہم نے ابھی تک اس کی بھی کوئی صحیح اور مکمل تصویر ان کے سامنے آویزاں نہیں کی، اس لئے وہ خفیف سی جھلک بھی ان کے آئینۂ ذہن سے محو ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں آج کی نشست میں اس "بھیروں ماتا" "اس" کالی دیوی" کے چند ایک روپ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں ـــــ چند ایک اس لئے کہ اس کی مکمل تصویر کھینچنے کے لئے کئی ایک مجلدات درکار ہوں گی ـــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ـــــ میرا خیال ہے کہ انہی چند ایک جھلکیوں سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا ہے۔

انسان فریب میں آسکتا ہے

ہندوؤں کی ساری تاریخ میں ـــــ اگر بھان متی کے اس پٹارے کو تاریخ کہا جا سکے ـــــ صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے، نام تو اس کا چانکیہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس لقب سے ہی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ ذاتِ شریف تھے کیا؟ اس نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ارتھ شاستر۔ یہ کتاب سنسکرت میں تھی لیکن اب اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطہ ہدایت دیئے گئے ہیں، وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں توجہ سے سنیئے:-

ہندو اصولِ سیاست

پہلا اصول ـــــ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول ـــــ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول ـــ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔
چوتھا اصول ـــ جن سے دوستی رکھی جائے، ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔
پانچواں اصول ـــ دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔
چھٹا اصول ـــ دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں۔ ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریقہ سے داخل کر کے، ففتھ کالم بنایا جائے۔ اور یہ سب کچھ مسلسل اور متواتر کیا جائے۔
ساتواں اصول ـــ رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ اور دوسرے ملکوں کے غداروں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔
آٹھواں اصول ـــ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں، مختصر الفاظ میں سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک مہاتما نے انہیں دیئے۔ یہ مہاتما۔ ان کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار ہے ـــ یعنی وہ زمانہ جس میں (ان کے عقیدہ کے مطابق۔ بھارت میں) سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد کل جگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے۔ جنہیں گاندھی جی کہا جاتا ہے۔ انہیں سچائی کا مجسمہ اور اہنسا (عدم تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی کیفیت کیا تھی، اس کے متعلق قائداعظمؒ

گاندھی جی

کی زبان سے سنیئے جنہیں ان کے ساتھ رات دن واسطہ پڑتا تھا۔ قائداعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس (منعقدہ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء) میں، پبلک پلیٹ فارم پر سے کہا تھا کہ

(مشکل یہ ہے کہ) گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ (تقاریرِ قائداعظمؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۸۹)

اسی طرح انہوں نے ۶ راگست سنہ ۱۹۴۵ء کو بمبئی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفیدِ مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں، وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہئیے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں معمہ ہیں۔ (تقاریرِ قائداعظمؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۸۲)

ان کی "مہاآتمیت" کا یہ عالم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران، جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا

ہوں اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گزرتی ہے، اسے سنتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، جنگ کے سلسلہ میں، بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

مہاتما جی نے اُدھر یہ کیا اور اِدھر کانگریس کی مجلسِ عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت ملک کے اختیارات کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے، انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے ـــــ اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومیت سے فرمایا کہ میرا کانگریس پر کیا اختیار ہے۔ میں تو اس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔

اہمسا کا اوتار

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہمسا کا اوتار کہا کرتے تھے۔ اہمسا کے معنی یہ ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی کے خلاف تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کی ـــــ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی ـــــ تعلیم پر عمل کیا جائے۔ لیکن انہی مہاتما جی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے سندھ میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر بے حد مظالم ہوئے۔ ہندوؤں نے یہ سب کچھ بھی کیا اور کوٹلیا کے اصولِ سیاست کے مطابق، مہاتما جی کو تار دے دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں۔ مہاتما جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی نہ تفتیش کی اور اپنے اخبار میں لکھ مارا کہ

> اہمسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق وہ ہے جسے ساری دنیا برتتی چلی آ رہی ہے یعنی جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں کو چاہیئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔ (ہریجن۔ بابت ۱۲/۳۹ ۱۲)

یہی مہاتما جی ہیں جنہوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کہا تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو۔ اہمسا کے ذریعہ کرو۔ اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں کو اپدیش دیا تھا کہ پٹھانوں سے جا کر چھین لو تاکہ اہمسا میں ذرا سی بھی ہمسا کی لاگ نہ رہے۔ اور دوسری طرف کلکتہ کی ہندو عورتوں سے تاکید کیا کہا جاتا تھا کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھیں اور فائر کرنا سیکھیں۔ گاندھی جی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا۔ ۲۱/۱۰ ۱۲)

جو گاؤ رکھشا ان کے دھرم کا جزو تھی، اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یوروپین کے لئے گاؤکشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے مگر ایک ہندو بھی، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مت، عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤکشی کو بند کر دیں۔ (الفضل ۹/۳/۱۸ بحوالہ اسٹیٹسمین)

یہ تھی سچائی کے اوتار اور اہنسا کے دیوتا گاندھی جی کی کیفیت۔ گاندھی جی کیا تھے، اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے ایک فقرہ میں وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جس کے لئے کتابوں کی کتابیں بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن گاندھی جی شوگرام آشرم میں، اپنی کٹیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی خاموشی سے پرارتھنا میں مصروف رہے۔ اس نے کٹیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر بہت اچھالا۔ صبح کو یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو ایک اخبار کا رپورٹر قائدِ اعظمؒ کے پاس گیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد، ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے کہا :-

YES ; PROFESSIONAL ETIQUETTE

یہ وہ ریمارکس ہیں جن کا بس لطف لیا جا سکتا ہے۔ سمجھایا نہیں جا سکتا۔

جس قوم کے "مہاتما" ایسے ہوں، اس کے عام افراد جس سیرت و کردار کے مالک ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر سری پرکاش پاکستان میں، بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۴۷ء کی شام، تھیاسوفیکل ہال کراچی میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندو مت ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے"۔

ہندو مت کا ضابطۂ اخلاق

اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندو مت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے جس پہ سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندو مت، انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ہر موقعہ اور ہر مقام کے لحاظ سے، مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کشتریوں) کو قتل و خون ریزی سکھاتا ہے۔ وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو۔ لیکن ویشں (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے، اس لئے وہ انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

کسی کو یہ بات اچھی لگے یا نہ لگے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت

میں کوئی اصولِ زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت، ہزارہا سال سے، مختلف حالات اور متباین ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت دسمبر ۱۹۴۸ء)

لال بہادر شاستری

یہی ہے وہ ہندو دھرم جس کے سب سے بڑے عالم[ل] اور ہندوستان کے (اُس زمانے کے) وزیر اعظم، مسٹر لال بہادر شاستری نے، جنوری ۱۹۶۵ء میں بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوشحالی کا ہے جو قوم کے باپو، مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدم تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں امن و صلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(اخبار مدینہ۔ بجنور۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۶۵ء)

یہ کچھ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے، جنوری میں کہا، اور اسی سال ستمبر میں، چوروں کی طرح، اکیس ڈویژن فوج پاکستان کے سر پر لا کھڑی کر دی۔ سچ ہے۔ اُس قسم کے "باپو" کے اسی قسم کے سپوت ہونے چاہئیں!! یہی تھے وہ بہادر شاستری جی، جن کی حکومت سے خود ہندوستان کے صحافی، تنگ آکر چیخ اٹھے تھے کہ

شاستری حکومت ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی ہے اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حساس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ ——— مسٹر شاستری ——— خود اس کائیں کائیں کا منجھا ہوا فنکار ہے۔

(نیوایج۔ بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۵/۹۔ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ ہے ہندو دھرم۔ اور یہ ہیں اس دھرم کے پجاری ——— کوٹلیا سیاست کا امام (آنجہانی) اُس باپو کے نامور سپوت!

اور شاستری (آنجہانی) اُس باپو کے نامور سپوت، مہاتما گاندھی، ستیا کے اوتار

یہ ہے ہندو دیوتا کے مجسمہ کا ایک روپ۔ اب آگے بڑھیئے!

[ل] شاستری، بہت بڑے عالم کو کہتے ہیں۔ یعنی جو شاستروں کا علم رکھتا ہو۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے دین کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں۔ یہ دعویٰ مسلمانوں

مذہب کے متعلق کا تھا جس کا تعلق مسلمانوں کے "مذہب" سے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی غیر مسلم کو دخل دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن دیکھئے کہ ہندوؤں کا اس باب میں رویہ کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کانگریس منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:-

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دُنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت جون ۱۹۳۸ء)

یہ تو رہا، دو قومی نظریہ کے متعلق۔ خود مذہب کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا:-

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقاء کا حمایتی ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام جون ۱۹۳۸ء)

آپ کہیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہریہ تھے اس لئے مذہب کے متعلق ان کا یہ طرزِ عمل حق بجانب تھا۔ وہ سیکولر نظام کے حامی تھے، اس لئے ان کی اس مخالفت میں، اسلام کی خصوصیت نہیں، وہ تمام مذاہب کے مخالف تھے۔ لیکن اوّل تو آپ نے اس اقتباس میں "منظم مذہب" کی تخصیص پر غور نہیں فرمایا۔ منظم مذہب — یعنی وہ مذہب جو مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ تنظیم کا حامی ہے (جسے قوم کہا جاتا ہے) ہندومت نہیں، اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ پنڈت جواہر لال ہندومت کو سرے سے مذہب ہی قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی کتاب "میری کہانی" میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں، مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ جب پنڈت نہرو کے نزدیک ہندومت کوئی مذہب نہیں تھا، تو اسے مٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اسلام تھا جو ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور جسے وہ مٹانا چاہتے

تھے۔ چنانچہ اس کی تصریح، نہرو کے ہم مرتبہ ایک کانگریسی لیڈر مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے ان الفاظ میں کر دی کہ

اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔

(ہندوستان ٹائمز ۵ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

قرآنی حکومت کے خلاف

اور اگر آپ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی سن لیجئے۔ ۱۹۴۱ء میں "اکھنڈ بھارت کانفرنس" کا اجلاس لدھیانہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ تمہیں اس کا علم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کر لیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیر و سناں کا نشانہ بنائے جائیں گے، ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوگی۔

بحوالہ طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۱ء)

یہ خیالات تنہا مسٹر منشی کے نہیں تھے۔ یہ ترجمانی کر رہے تھے ہندوؤں کے تمام بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے خیالات اور جذبات کی۔ مثلاً کانگرس کے سب سے بڑے ترجمان، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا:-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔

یہاں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہندو نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اسلامی حکومت کے احیاء کی کوشش کریں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا اور پاکستان کی مملکت وجود میں آگئی تو اس وقت بھی

اسلامی حکومت کے خلاف

ہندوؤں کی پکار یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی الگ مملکت قائم کر لی تو خیر، لیکن ہم (یعنی ہندو) اسے برداشت نہیں کر سکیں گے کہ وہ وہاں اسلامی حکومت قائم کر لیں۔ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:-

پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس

حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محترم لیاقت علی خاں (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پہ قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی سٹیٹ ہوگا ...... چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی سٹیٹ ہے۔

لیکن تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہا جاتا تھا کہ

ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو سٹیٹ ہونا چاہیے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ الفاظ ڈاکٹر رادھا مکرجی کے تھے جو ہندو مہا سبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔ یہ الفاظ انہوں نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔

اور مسٹر ساورکر نے یہ کہہ کر سارا ٹنٹا ہی ختم کر دیا تھا کہ

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر، نسل اور روایات وغیرہ۔ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔

(ستیٹسمین ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۳۹ء)

آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ اس باب میں گاندھی جی کا "ذکرِ خیر" آیا ہی نہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھے تھے! جی نہیں۔ گاندھی جی ایسے اہم معاملہ میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کا بات کرنے کا انداز اپنا تھا۔ سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا کرتے اور کیا کہتے تھے۔

مسٹر گاندھی کا اپدیش

مسٹر گاندھی نے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا جس میں کہا تھا:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے۔ خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے اخبار "ہریجن" کی ۹ فروری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں لکھا :-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے اپنی جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے[1]۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ، مذہب، ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

آپ کہیں گے کہ مسٹر گاندھی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے اور سیکولر نظامِ حکومت کے قائل کو مذہب کے متعلق یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسٹر گاندھی واقعی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں، اس خط کے الفاظ سے لیجئے جو قائد اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو لکھا تھا اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا :-

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا زندگی میں مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے ـــــ کیا وہ جذبہ، وہ مقصد، مذہبی ہے یا معاشرتی، یا سیاسی ـــــ تو آپ نے کہا تھا کہ "خالص مذہبی"۔

یعنی اپنی سیاسی جدوجہد کا جذبۂ محرکہ خالص مذہبی، اور دوسروں کو تلقین کہ وہ مذہب کو سیاست میں دخیل کار نہ ہونے دیں۔ یہی تھی مسٹر گاندھی کی وہ دورخی پالیسی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را ۔۔۔ نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر ۔۔۔ بدوشِ خود ببر زنارِ خود را

اور مسلمانوں کا یہ طعن کسی مفروضہ پر مبنی نہیں تھا، ایک حقیقت تھا۔ مسٹر گاندھی اِدھر ان سے یہ کہہ رہے تھے

ہندوستان کی حکومت

کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ اور اُدھر، ہندوستان میں وہ جس قسم کی سیاست رائج کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق، کانگریس کے جنرل سیکرٹری، اچاریہ کرپلانی نے، اگست ۱۹۳۹ء میں، اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت

---

[1] ہندو مذہب کیا ہے، اس کے متعلق کسی دوسری نشست میں عرض کیا جائے گا۔

ب کچھ داخل ہو ۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی
علی فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی
ت ہو، بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع
ہ جسے ہم تاریخ کا نیا دَور کہہ سکیں ۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس
ے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں ۔

...دھا اسکیم

کو سب سے بڑا ڈر یہ کھائے جا رہا تھا کہ مسلمان بچّوں کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہوتا ہے کہ اسلام باقی
مذاہب کے مقابلہ میں افضل ہے ۔ ان کی سکیم یہ تھی کہ مسلمان بچّوں کے دل سے اس خیال
کو نکال دیا جائے تاکہ ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی عظمت و اہمیت کا احساس
ٹ جائے ۔ اس کے لئے انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم) کے مشورہ اور تعاون سے ہندوستانی بچّوں
ے لئے ایک مشترکہ تعلیم کی سکیم مرتب کی (جو واردھا کی تعلیمی سکیم کے نام سے مشہور ہوئی) اس سکیم کا مقصد
تھا، اس کا اندازہ مسٹر گاندھی کے اس وضاحتی بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اخبارات
دیا تھا ۔ اس میں انہوں نے کہا تھا :۔

مختلف طبقات و مذاہب کے بچّوں میں، رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے، اس کے
پیشِ نظر میں اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب
دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے ۔
(ہندوستان ٹائمز ۱۷-۸-۳۸ ۔ بحوالہ طلوعِ اسلام ۔ اگست ۱۹۳۸ء)

[طلوعِ اسلام نے اُسی زمانے میں اس انتہائی شر انگیز تعلیمی سکیم کے خلاف کس قدر ملک گیر مہم چلائی
ور کس طرح اسے، اور اس کے تحت مرتّب کردہ نصاب کی کتابوں کو غرقِ سمندر کرا دیا، یہ ایک الگ داستان ہے
جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں]

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت

لیکن جب، اور ان کے چیلوں چانٹوں کی ان تمام سازشوں اور روباہ بازیوں کے باوجود، تحریکِ
پاکستان آگے بڑھتی گئی حتّٰی کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں حصولِ پاکستان کا
ریزولیوشن پاس ہو گیا تو مسٹر گاندھی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور
کھل کر سامنے آ گئے ۔ انہوں نے ۲ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے ایک بیان میں کہا :۔

میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال
حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام
کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ "اسلام" کے اندر پوشیدہ ہے ۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت
اس لئے پیش آئی کہ آج کل مُسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت
ٹھیس لگ رہی ہے ۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں
کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کروں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے ۔
(بحوالہ طلوعِ اسلام ۔ جون ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے، اسی سلسلۂ مضامین کی دوسری قسط میں (۱۴؍ اپریل ۱۹۴۰ء کو) لکھا:۔

میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے ۵؍ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ

میں ایک تنگ نظر ہندومت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسرے میں مدغم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں کے متعلق، ہندوستان کے ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ مولانا حالیؔ نے بھارت کو "اکّال الامم" کہا ہے۔ یعنی وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل گئی جو زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک باہر سے آئی تھیں۔ جب وہ قومیں ہندوستان میں آئی تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص، جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب، جُداگانہ تہذیب تھی، لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود کا نشان تک اس طرح مٹ گیا گویا وہ کبھی دُنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں۔ لیکن ان سب میں، مسلمان سخت ہڈی کے نکلے۔ یہ، ہندوؤں کی تمام چالوں کے باوجود، ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کے لئے خارِ پہلو بن رہی تھی۔ مہاتما جی اور ان کے چیلوں کی، مسلمانوں کے غم میں، یہ تمام دردناک آہیں، اور جگر گداز نالے، اسی کانٹے کی کھٹک کا نتیجہ تھیں۔ پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اُن کے بڑے بڑے مہاپُرش، اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا، یہ کہیں جانے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے مارچ ۱۹۴۲ء میں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا:۔

جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں، ان میں سے نوّے فیصد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ اُن لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۲ء)

ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دینے کے یہ خیالات اور عزائم تحریکِ پاکستان کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ وہ زمانہ دراز سے انہی خطوط پر سوچ بھی رہے تھے اور گامزن بھی تھے۔ اس تفصیل میں جانے کے لئے تو مجھے ہندوستان کی تاریخ کے سینکڑوں صفحات سامنے لانے پڑیں گے (جو سرِدست مشکل ہے)۔ میں صرف سیواجی کے حوالے سے چند ایک واقعات پر اکتفا کروں گا۔ لیکن اس کے لئے بھی پہلے اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ

... ہندو شاستروں کی تقسیمِ عمل کی رو سے سلطنت کی حفاظت کا ذمہ کھشتریوں کا ہوتا ہے اور بظاہر حکومت کے سربراہ بھی وہی ہوتے ہیں لیکن زمامِ حکومت درحقیقت برہمنوں کے ہاتھ میں رہتی ہے اور ان کے فیصلوں کے خلاف کوئی راجہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کی سلطنت کے خلاف جتنی سازشیں ہوئیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں برہمنوں ہی کی پیدا کردہ تھیں ـــــ آج بھی ہندوستان کی حکومت براہمنوں ہی کے ہاتھ میں ہے ـــــ مغلیہ سلطنت کے انحطاط پر، سب سے پہلے، اس کے خلاف

سیواجی

مرہٹوں کو اُبھارا گیا۔ سیواجی ابھی نوعمر ہی تھا کہ سمرتھ رامداس نامی براہمن نے مسلمانوں کے خلاف اس کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ اس نے (لالہ لاجپت رائے کے الفاظ میں، جنہیں انہوں نے اپنی تصنیف، سیواجی کی سوانح حیات میں قلمبند کیا ہے) "سیواجی کو بار بار اسلام کے خلاف جنگ کرنے کا اُپدیش دیا۔ اس امر کی شہادت اس خط سے بھی ملتی ہے جو سیواجی نے، راجہ جے سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں اس نے تحریر کیا تھا :-

میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور ہی مہم کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیئے تھا جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی انہیں انصاف کرنا آتا ہے ..... میری بادلوں جیسی چھانے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک سارے مسلمان اس سیلابِ خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔[1]

سیواجی اپنے مذموم ارادوں میں ناکام رہ کر دنیا سے چل بسا، تو اسی برہمن سمرتھ رامداس نے، اس کے بیٹے سنبھاجی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس نے اس سے کہا کہ

آپس میں محبت سے رہو لیکن اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈ کر اپنے راستے سے ہٹا دو .....
لوگوں کے دل میں ان ملیچھوں کا مقابلہ کرنے کا خیال پیدا کرو۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

سنبھاجی کے بعد، اس کا بیٹا، ساہو برسرِ اقتدار آیا تو اسے ایک اور برہمن ـــــ باجی راؤ ـــــ نے مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا اور کہا کہ "ان ملیچھوں کو بھارت ورش کی پوتر بھومی (مقدس سرزمین) سے نکال باہر کرنا، تمہارا دھارمک (مذہبی) فریضہ ہے"۔ اس کی تقریر کا یہ فقرہ آج تک ہندوؤں کے ہاں دہرایا جاتا ہے کہ

کاٹو۔ درخت کو تنے سے کاٹو تو شاخیں خود بخود گر جائیں گی۔ میری بات کو مانو تو میں اٹک کی دیواروں پہ مرہٹوں کا جھنڈا نصب کر دوں گا۔ (تاریخ مہاراشٹر۔ بھائی پرمانند)

لیکن اس منصوبے کو احمد شاہ ابدالی نے خاک میں ملا دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد، مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان قعرِ مذلت میں گر گئے۔ لیکن ہندوؤں

---

[1] بحوالہ ویر کیشری شواجی، مصنفہ پنڈت نند کمار شرما۔ اور سواجی مصنفہ لالہ لاجپت رائے۔

کے دل میں ان کے خلاف نفرت و عداوت کی جو آگ تھی وہ بجھ نہ سکی۔ یہ اس لئے کہ، اس قدر انحطاط اور زوال کے باوجود مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے باقی تھے۔ وہ ہندو قوم کا جزو بننے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، اب ہندو کے سامنے جنگ کا میدان نہیں تھا، سیاست کی بساط تھی۔ اور اس

تلک اور دیانند

بساطِ سیاست کے اوّلین شاطر، پھر دو براہمن تھے ــــ ایک بال گنگا دھر تلک، اور دوسرا سوامی دیانند سرسوتی (آریہ سماج کا بانی) ان کا جامع منصوبہ یہ تھا کہ مسلسل اور وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ کے ذریعے، ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف، نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو منظم کر کے، ایک متحدہ محاذ کی شکل دے دی جائے۔ اس سازش کے جال اس قدر وسیع اور اس کے عزائم اس قدر خطرناک تھے کہ خود حکومت کو ان کی تحقیق کرنے کے لئے ایک کمیٹی بٹھانی پڑی جو اس کے صدر (مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ ٹی۔ رولٹ) کی نسبت سے رولٹ کمیٹی کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو اس سے عجیب و غریب کوائف کا انکشاف ہوا۔ تلک نے ہندوؤں کے دو میلے منعقد کرنے کی طرح ڈالی تھی۔ یہ تحریک بظاہر بڑی معصوم سی تھی لیکن اس میں کس قدر خطرات پوشیدہ تھے اس کا اندازہ کمیٹی کی رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔

گنپتی کا میلہ

مغربی ہندوستان میں اس تحریک کے آثار ابتدا میں دو سالانہ میلوں میں رونما ہوئے جن میں ایک تو ہندو دیوتا گنپتی کے اعزاز میں منعقد ہوتا ہے اور دوسرا مرہٹہ سردار سیواجی کے اعزاز میں جس نے اہالیانِ دکن کو مسلمان حکمرانوں کے خلاف متحد کیا تھا۔ گنپتی کے میلے کی دھوم دھام سے منائے جانے کی رسم تازہ معلوم ہوتی ہے۔ خیال غالب ہے کہ بمبئی میں ۱۸۹۳ء میں جو فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اس کے بعد مفسدوں نے ہندو مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کا بہترین ذریعہ یہ سوچا کہ گنپتی کا میلہ اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا جائے ..... اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو زخمی کیا جائے ..... اس خیال کو لے کر ستمبر ۱۸۹۴ء میں مفسدوں نے اس معمولی پوجا کو عالمگیر نمائش بنانے کے انتظامات کے لئے میلے کی ایسی جگہ منتخب کی جہاں عوام بآسانی جمع ہو سکیں۔ نیز ایسا انتظام کیا گیا کہ جو لوگ گتکا بازی اور دیگر جسمانی ورزشوں کے ماہر ہوں وہ گنپتی کے حضور اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ متواتر دس دن تک نوجوانوں کے گروہ گلیوں اور بازاروں میں ایسے اشعار گاتے پھرے جن سے مسلمانوں اور حکومت کی مخالفت مقصود تھی ..... قدرتاً اس تہوار سے بدامنی اور فساد کی کئی وارداتیں ہوئیں۔ چنانچہ ایک موقعہ پر ساٹھ ستر آدمیوں کے جلوس نے ایک مسجد کے قریب سے گزر کر مسلمانوں کے مذہبی مراسم میں دخل اندازی کی۔

گنپتی کے اس میلے میں اس قسم کے اشلوک گائے جاتے تھے:۔

---

[1] پاکستان کے معمارِ اوّل، سرسیدؒ نے یہ بات اعلانیہ کہہ دی تھی۔

بدطینت لوگ قصائیوں کی مانند جلادوں کی سی بے رحمی سے گائیوں اور بچھڑوں کو ذبح کرتے ہیں۔
اٹھو اور گائے ماتا کی مدد کرو!

دوسری طرف' سیواجی کے جنم دن اور تاجپوشی کے دن کی تقاریب پر پونا میں اسی قسم کے میلے منعقد کئے جانے لگے جن میں جی بھر کر مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے تھے۔ ان میلوں میں اس قسم کے شلوک پڑھے جاتے تھے :-

یاد رکھو! محض سیواجی کی کہانی سنا دینے سے آزادی حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ ضروری ہے کہ لوگ سیواجی اور باجی راؤ کی مانند اولوالعزمانہ جانبازی دکھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب تم کو ڈھال تلوار سے مسلح ہو جانا چاہیئے کہ ہم نے دشمن کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم دشمنوں کو مار کر مریں گے۔ تم عورتوں کی طرح بیٹھے کہانیاں سنتے رہو گے۔

اسی میلہ کے ایک اجلاس میں خود تلک صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی ریمارکس میں کہا :-

سوال یہ ہے کہ کیا سیواجی نے افضل خاں کو قتل کر دینے میں کوئی پاپ کیا تھا؟ اس کا جواب مہابھارت کے اوراق میں ملے گا۔ بھگوان کرشن کا صاف اپدیش ہے کہ نشکام کرم ہوتے ہوئے بیشک اپنے گورو اور رشتے دار تک کو ہلاک کر دو۔ تم پر کوئی الزام عائد نہیں ہو گا۔ افضل خان کے قتل میں سیواجی کی ذاتی اغراض پوشیدہ نہ تھیں۔ اس نے جو کچھ کیا رفاہِ عام کی خاطر کیا تھا۔ اس کے قتل کو گناہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ہمارے مکان میں چور داخل ہو جائیں اور ہم دیکھیں کہ ان کو نکالنے کے لئے ہم میں کافی قوت نہیں ہے، تو چاہیئے کہ انہیں اندر بند کر کے مکان کو آگ لگا دیں اور ان کو زندہ جلا دیں۔

آریہ سماج

ہم نے پہلے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کی تحریک کے بانی بال گنگا دھر تلک اور سوامی دیانند تھے۔ تلک کے عزائم کی ایک جھلک ہمارے سامنے آ گئی۔ سوامی دیانند نے ہندوؤں کی ایک ملک گیر تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام آریہ سماج تھا۔ اس کے قیام کا مقصد اس تنظیم کے ایک معروف لیڈر' لالہ دھنپت رائے نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا :-

ہندوستان میں سوائے ہندو راج کے دوسرا راج ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک دن آئے گا کہ ہندوستان کے سب مسلمان شدھ ہو کر آریہ سماج ہو جائیں گے اور اس طرح آخر یہاں ہندو ہی رہ جائیں گے۔ یہ ہمارا آدرش (نصب العین) ہے۔ یہی ہماری آشا (آرزو) ہے۔ سوامی جی مہاراج نے آریہ سماج کی بنیاد اسی اصول کو لے کر ڈالی تھی۔

(اخبار پرکاش، لاہور - ۲۶ اپریل ۱۹۲۵ء)

گئو رکھشا

عوامی سطح پر مسلمانوں کے خلاف جذباتِ نفرت و انتقام کی آگ بھڑکانے کے لئے۔ سوامی دیانند نے گئو رکھشا (گائے کی حفاظت) کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ واضح رہے کہ ویدوں اور شاستروں کی رو سے' گائے کا گوشت کھانا نہ صرف جائز ہے بلکہ اسے دیوتاؤں کے استھان پر بطور نذر نیاز چڑھانے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ لہٰذا، گئو رکھشا کا سوال محض مسلمانوں کے خلاف جذباتِ نفرت مشتعل کرنے کا ایک عوامی حربہ تھا چنانچہ اخبار پرتاپ کے ایڈیٹر، مہاشہ کرشن نے اس باب میں لکھا تھا کہ

گئو رکھشا کے سوال کا آریہ سماج کے ساتھ بہت سمبندھ (تعلق) ہے کیونکہ اس پر بھارت ورش کا جیون نرجر (زندگی کا دار و مدار) ہے۔ گئو رکھشا پر سب سے پہلے لیکچر رشی دیانند ہی نے دیئے تھے ..... اور وہ چاہتے تھے کہ گاؤکشی کو قانوناً بند کرا دیا جائے۔

(پرتاپ۔ لاہور۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۰ء)

اور اخبار ملاپ نے اپنی ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

گئو ہتیارے (گائے پر ظلم کرنے والے) کو سیسہ کی گولی سے اڑا دینے کے لئے شاستروں میں آگیا (حکم) ہے۔

آریہ سماجی عام جلسوں میں اسی قسم کی اشتعال انگیز تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۶ء میں سکھر کے ایک جلسہ میں مہاشے پرتاپ سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا :-

گائے ماتا کے گلے پر چھری پھیرنے والوں کے لئے تمہارے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہیے بھیشم کے سپوتو! ارجن کے دلاورو! اگر تم ایک گائے کی خاطر، کراچی سے مکہ تک تمام مسلمانوں کو (بھی ختم کر دو) تو بھی تھوڑا ہے۔

مہاتما گاندھی

(مہاتما) گاندھی کو اہنسا (عدم تشدد) کا دیوتا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں ان کا دیا کھیان بھی سن لیجئے جسے پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گائے کُشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں، عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤکشی کو چھوڑنے پر مجبور کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

(سٹیٹسمین۔ بحوالہ الفضل۔ ۹ مارچ ۱۹۱۸ء)

ان اشتعال انگیز بیانات اور تقاریر کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں جگہ جگہ گاؤکشی کی بناء پر ہندوؤں نے فسادات برپا کئے اور ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

شدھی کی تحریک

مسلمانوں کو ہندو جاتی کے اندر جذب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو شدھ کر کے، ہندو بنا لیا جائے۔ واضح رہے کہ کسی غیر ہندو کو ہندو مذہب میں داخل کرنے کا تصور یکسر ہندو مذہب کے خلاف ہے۔ ہندو مذہب تبلیغی ہے ہی نہیں۔ ہندو وہی ہو سکتا ہے جو ہندوؤں کے گھر پیدا ہو۔ جس مذہب میں پیدائشی ذات (ورن) تک نہ بدلی جا سکتی ہو اس میں تبدیلیٔ مذہب سے کسی کو ہندو بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کے لئے، شدھی کو بھی جائز قرار دیا گیا اور یہ تصور بھی سوامی دیانند ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے، سوامی دیانند کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ

سوامی دیانند پہلا شخص تھا جس نے ہندوؤں کو شُدھی کی طرف راغب کیا۔

شُدھی سے اصل مقصد کیا تھا، اس کی بابت، ایک اور ہندو کی زبان سے سنیئے۔ اخبار پرتاپ (لاہور) کے ایڈیٹر نے ۱۴ر جنوری ۱۹۲۶ء کو لکھا تھا :-

ہندو کیا کریں جب کہ دنیا کا نظام ہی تعداد کے سہارے چل رہا ہو۔ اس ملک کی حکومت صرف تعداد کے اصول پر قائم ہے جس کے لئے ہندوستانیوں کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں کونسلوں میں ادھیکار (اختیارات) بھی تعداد کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں عملی طور پر مسلم حکومت ہے۔ ہم پنجاب میں رہتے ہوئے جانتے ہیں کہ مسلم حکومت کیا ہے؟ اس وقت شدھی ہندوؤں کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن رہی ہے۔ مسلمان نقی سے سات کروڑ تک پہنچ چکے ہیں۔ عیسائی چالیس لاکھ ہو چکے ہیں۔ سات کروڑ مسلمانوں کے سامنے بائیس کروڑ ہندوؤں کا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر کہیں ان کی تعداد بڑھ گئی تو نہ معلوم کیا ہوگا۔ دھرم کو دھرم کے لئے ہونا چاہیئے لیکن ہندوؤں کو تو دوسری ضروریات نے مجبور کر دیا ہے کہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو گلے لگائیں اور جو ان کے بھائی بننا چاہیں ان کو اپنا بھائی بنائیں۔ ہندو اگر اب بھی نہ جاگے تو ان کا کام ختم ہے۔

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اہلِ ہند کو سیاسی اصلاحات کی رُو سے کچھ اختیارات مل رہے تھے اور یہاں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ شُدھی کی تحریک اسی کی پیش بندی کے لئے اختیار کی گئی تھی۔

دہلی سے شائع ہونے والے اخبار تیج نے ۱۹۲۶ء میں، اپنے کرشن نمبر میں لکھا تھا :-

جن گائیوں کو بھگوان کرشن شردھا (عقیدت) کے ساتھ جمنا ندی کے پوتر استھان (مقدس مقام) پر چراتے تھے، آج تم ان کی رکھشا کرو اور ان کو گئو ہتیا کاروں کے مظالم سے بچاؤ۔ یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے جب آپ شدھی، سنگھٹن اور دلت ادھار کا اپنے دل میں نشچہ (عہد) کر لیں .... یہی گوپال (گائیوں کے پالنے والے کرشن) کی سچی بھگتی ہوگی۔ اسی سے ہمارا راشٹر بنے گا۔ اسی سے ہمارے اختلافات مٹیں گے۔ اسی سے باجا اور مسجد کا سوال حل ہوگا۔ اسی سے ہمیں ہماری سوتنترتا پراپت (آزادی حاصل) ہوگی۔ دُنیا میں پھر آریہ دھرم کا جھنڈا بلند ہوگا۔ بھارت چکرورتی راج، (عالمگیر حکومت) کا سوامی (مالک) بنے گا۔

اچھوتوں کو جذب کرنا

گئو رکھشا اور سنگھٹن کی تحریکوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں دلت اُدھار کا بھی ذکر آیا ہے۔ یہ بھی جمہوریت کا توڑ تھا۔ دلت ادھار کے معنی ہیں اچھوتوں کی اصلاح۔ ہندو دھرم کی رو سے اچھوت (یا شودر) وہ چوتھا ورن ہے جس میں جنم لینے والے کسی اونچی ذات کے ہندو کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ پیدائشی ناپاک ہوتے ہیں اور ساری عمر ناپاک رہتے ہیں یہ درحقیقت ہندوستان کے قدیم اصلی باشندے تھے جنہیں ہندوؤں نے اپنی خدمت کے لئے غلام بنا رکھا تھا۔ یہ کبھی ہندوؤں کا جزو نہیں بن سکتے تھے۔ ان کا جزو بننا تو ایک طرف، منوسمرتی میں لکھا ہے کہ

اگر کوئی شودر کسی دوج کے برابر بیٹھے تو اس کی کمر میں داغ دے کر اسے گاؤں سے نکال دینا چاہیئے۔ یا اس کے چوتڑوں کو تھوڑا سا کاٹ ڈالنا چاہیئے۔

اچھوت تو ایک طرف، پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا تعلیم یافتہ، بین الاقوامی شہرت کا لیڈر، بڑے فخر سے ...ا تھا کہ

میں جب کسی انگریز سے ملتا ہوں تو ملنے کے بعد پانی سے ہاتھ دھو لیتا ہوں۔

...توں کو ہندو قرار دینے سے مقصد کیا تھا، اس کے متعلق اخبار ملاپ نے اپنی ۲۲ جنوری ۱۹۲۶ء کی اشاعت ...لکھا تھا کہ

ہندوؤں کے لئے اچھوت آدھار کا مسئلہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ مردم شماری میں ہندوؤں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ جب کہ مسلمان اور دیگر اقوام ترقی کر رہی ہیں۔ ایک ہندو کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنے وقت اور دھن کا کچھ حصہ اچھوت ادھار کے لئے صرف کرے۔

...اخبار میں مسٹر کیلکر جیسے ہندو لیڈر نے لکھا تھا کہ

خود غرضی کے خیال سے بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اچھوت ادھار کے کام کو ہاتھ میں لے کر اچھوتوں کو جلد از جلد اپنے اندر ملا لیں کیونکہ موجودہ حکومت میں تعداد ہی ایسی چیز ہے جس پر حکومت میں نمائندگی کا دارومدار ہے۔

...توں میں تبلیغ کا کام مسلمانوں نے بھی شروع کیا تھا۔ ہندو اسے کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے متعلق، اور ...خود (مہاتما) گاندھی کی زبان سے سنیئے۔ جب انہوں نے سنا کہ مسلمانوں نے کچھ اچھوتوں کو مسلمان بنا لیا ہے تو

انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوا اور کہنے لگے کہ "مجھے تو اس کا پتہ تک نہیں۔ آپ کی غلطی ہے جواب تک خاموش رہے۔ یہ بہت برا ہوا۔ کم از کم مجھے اس کی اطلاع ملنی چاہیئے تھی۔ اچھوت ادھار کا کام صرف ہندوؤں کا ہے"۔

(پرتاپ ۲۰-۱۲/۲۴)

...طرف اچھوتوں کو ہندو قرار دے کر جمہوری طریق سے ہندو راج کے منصوبوں کو تقویت پہنچائی جا رہی تھی

...دو سنگھٹن

اور دوسری طرف، ہندو تنظیم (سنگھٹن) کو مستحکم کر کے، بزور شمشیر ہندوؤں کی حکومت قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ چنانچہ تحریک سنگھٹن کے مشہور راہنما، لالہ ہردیال نے ...الفاظ میں کہا تھا کہ

ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ بھارت ورش میں ایک ایسی مضبوط، زبردست، متحد اور بیدار سیاسی جماعت قائم کی جائے جو ایک آزاد ہندو ریاست کے آدرش (نصب العین) تک پہنچنے کی کوشش کرتی رہے۔ گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق ایک ایسا دل بنایا تھا۔ آج بھی سوراج پارٹی، انڈی پنڈنٹ پارٹی، لبرل پارٹی وغیرہ سیاسی جماعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ایسا ہندو قومی دل قائم کیا جائے جو ایک آزاد قومی ریاست کی بنیاد ڈالے۔ جب انگلستان کچھ عرصہ بعد ہوم رول یعنی (۷۵) فیصد سوراجیہ ہمیں پیش کرے تو وہ ہندو قومی دل کے ساتھ عہد و پیمان کرے۔

ہندو سنگھٹن کا آدرش (نصب العین) یہ ہے کہ ہندو قومی سنستھاؤں (انسٹی ٹیوشنز) کی بنیاد

پر ہندو قومی ریاست قائم کی جائے۔ ہندو قومی سنستھائیں یہ ہیں: مثلاً سنسکرت بھاشا، ہندو قوم کا اتہاس (تاریخ)، ہندو تہوار، ہندی مہاپرشوں کا سمرن (ہندو سورماؤں کا تذکرہ) ہندوؤں کے دیش، یعنی بھارت یا ہندوؤں کے ستھان (ملک) کا پریم، ہندو قوم کی ساہتیہ (تحقیق) کا پریم وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ آج کل نیم عربی، نیم ایرانی مسلمانوں کو قومی تحریک میں خواہ مخواہ شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس صداقت کو نہیں سمجھتے کہ ہر ایک قومی ریاست پرانی سنستھاؤں پر قائم کی جاتی ہے جن سے لوگوں میں یگانگت کا بھاؤ (رجحان) پیدا ہوتا ہے۔ آج کل کے ہندی مسلمان تو محض جملہ معترضہ ہیں۔ ان کا یہی مستقبل ہے کہ آہستہ آہستہ شدھی کے ذریعے دوبارہ ہندو قوم کے اندر شامل ہو جائیں۔ راج نیتی شاستر (ضابطۂ سیاست) کے مطابق مجھے کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔

(ملاپ ۲۵/۵/۲۰)

انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں جو اخبار تیج کی ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ لکھا تھا:۔

ہندو سنگھٹن کے لئے ہندو سوراجیہ (حکومت) کا آدرش (نصب العین) ضروری ہے۔ پنجاب میں ہندو سوراجیہ قائم کرنے کے لئے آدرش ہی سے لوگوں میں قربانی کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہندو سنگھٹن کا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ جب تک ہندوستان بالخصوص پنجاب، بدیشی مذہبوں سے پاک نہیں ہوگا ہمیں کبھی چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا وہ کپوت ہے، بے جان ہے، مُردہ دِل ہے، بے سمجھ ہے۔ اس نے ہندوؤں کو مزید مشتعل کرنے کے لئے لکھا: "پنجاب اور ہندوستان میں دو قومیں نہیں رہ سکتیں۔ یا سب ہندو اسلام قبول کر لیں یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنا لو۔ یہی اس سوال کا حل ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسی انوکھی چیز ہے کہ مسلمان کسی ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو یا اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فیصد اسلام سے صرف بلوہ فساد ہوں گے۔ بیس فیصد اسلام کے روڑے کو کوئی ملک ہضم نہیں کر سکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہے گا۔ پس اسلام کی تاریخ اور مزاج کو جان کر ہمیں ہندو اتحاد کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ اب تو صرف ذاتی طور پر شدھی کرنی چاہیئے سوراج ملنے پر ریاست کی مدد سے شدھی کی تحریک کو ترقی دینی چاہیئے"۔

لالہ ہردیال اپنی اس تحریک کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ افغانستان کو بھی ہندو دائرے کے اندر سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا:۔

افغانستان کوئی جُدا ملک نہیں۔ یہ ہندوستان، پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ افغانستان میں ہماری مُورتیاں، بُت اور مندروں کے کھنڈرات آج تک پائے جاتے ہیں جب تک افغان اور سرحدی قبائل کے مسلمان بھی ہندو قوم میں شامل نہیں کئے جائیں گے، اس وقت تک ہمارے ملک کی حفاظت کا پورا پورا انتظام نہیں ہو سکتا۔ تاریخ ہند سے ظاہر ہے کہ ان پہاڑی علاقوں سے ہم کو بہت

دُکھ پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس دُکھ کا اندیشہ صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ بیدار لوگ اسلام کے پیرو اور مسلمان ہیں۔ مگر جب ہم ان کو ہندو بنالیں گے تو یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ لہٰذا، افغان اور سرحدی مسلمانوں کو ہندو بنا دینا ہمارا بہت ضروری فرض ہے۔ تمام ہندو قوم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہندو کے سامنے یہ تین اصول ہر وقت رہنے ضروری ہیں۔ ایک تو ہندو سوراج، دوسرے ہندوستان کے سب مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانا، تیسرے افغانستان اور سرحد کو ختم کرنا اور وہاں کے باشندوں کو ہندو بنانا۔

اس کے بعد وہ افغانستان سے بھی آگے بڑھے اور کہا کہ

جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شدھی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، فجی اور دوسرے ملکوں پر بھی قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے۔ پس ہندوستان کو اگر کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شدھی، افغانستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پورے ہو جائیں گے۔ (اخبار ملاپ۔ ۱۳ رجون ۱۹۲۵ء)

اُسی زمانے میں ہندوؤں کے ایک اور مشہور لیڈر، سوامی سیتہ دیو نے اپنی ایک تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو ہم مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے :-

① ـــــ قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔
② ـــــ محمدؐ کو خدا کا نبی مت مانو۔ (معاذ اللہ)
③ ـــــ مکہ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔
④ ـــــ سعدی اور رومی کی بجائے کبیر اور تلسی داس کو پڑھو۔
⑤ ـــــ اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔
⑥ ـــــ وہ تمام تقریبات مناؤ جن کا تعلق رام کرشن اور دوسرے دیوتاؤں سے ہے۔
(اخبار وکیل۔ امرتسر۔ ۹۔ دسمبر ۱۹۲۵ء)

اور پروفیسر رام دیو نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا :-

ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔
(گرو گھنٹال۔ ۱۰ رجنوری ۱۹۲۷ء)

یہ تھے ہندو کے وہ عزائم جن کے علی الرغم ہندوستان میں تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوا۔ آپ سوچئے کہ جن کے یہ عزائم ہوں وہ اس تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں کس طرح برداشت کر سکتی تھی؟ وہاں کے لیڈروں نے ایک طرف تو بساطِ سیاست پر اس کی مخالفت شروع کی اور دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف فسادات کا آغاز کر ان فسادات میں مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کی تفصیل طول وطویل ہے۔ (مسلم لیگ

کی طرف سے متعین کردہ پیرپور کمیٹی کی رپورٹ اس پر شاہد تھی)۔ میں اِس مقام پر صرف ایک واقعہ کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ ۱۹۴۰ء میں سی۔ پی کے ہوشنگ آباد ضلع میں ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو بُری طرح سے قتل کیا اور لوٹا۔ اور وہاں کی کانگریسی حکومت نے، خود مسلمانوں کو گرفتار کرکے انہیں جیل میں ٹھونس دیا۔ اس سلسلہ میں ان پر کس قدر تشدد کیا گیا اس کے متعلق، وہاں کے سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا:-

مسلمانوں کا قتلِ عام

تمام مسلمانوں کی ذلت کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر تشہیر کی گئی۔ اور پھر سکول کے ایک کمرے میں ۱۴۵ مسلمان بند کر دیئے گئے۔ یہ کمرہ تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا جس میں یہ مسلمان، رات بھر مقفل رکھے گئے۔ ان لوگوں کی تشہیر کے لئے جب انہیں سڑکوں پر گھمایا گیا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ یہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت گرمی یقیناً زیادہ ہوگی۔ جو مجسٹریٹ اس تشہیر کے وقت ساتھ تھا اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اتنی شدید گرمی تھی کہ اس تشہیر میں کئی لوگوں کو قے آگئی .... حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ برسرِ عام کھڑا کرکے ان کی جانچ کرنے سے لے کر ۴۵ آدمیوں کو ان کے جیل بھیجنے کے وقت تک پولیس کا جو عمل رہا ہے اسے دیکھ کر آج کل کے نازی جرمنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

(مدینہ۔ بجنور ۲۵۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۴۰ء)

یہ تھا کانگریس حکومت کے تحت مسلمانوں کی اقلیت کا حشر!

کہا یہ جاتا ہے — اور خود اُس زمانے کے مسلمان نیشنلسٹ، جو حصولِ پاکستان کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے، کہا کرتے تھے — کہ ہندو، وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا، جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خود مغربی جمہوریت ہی کس قدر ملعون و مردود نظامِ مملکت ہے، اگر مغربی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو ہندوستان کی جمہوریت بھی نرالے قسم کی ہوتی — اور ہے — مغربی اندازِ جمہوریت میں ہوتا یہ ہے کہ جو پارٹی آج اقلیت میں ہے اس کے لئے امکان ہے کہ وہ کل کو اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کرلے لیکن ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اور چونکہ یہ اقلیت مذہب کی بنیاد پر تھی، اس لئے اس کے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ کبھی اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر سکے۔ لہٰذا، اسے مستقلاً ہندو اکثریت کی محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ ہندو کی محکومی کس قسم کی ہوتی، اس کا جواب ہم سے نہیں، خود وہاں کے اربابِ سیاست کی زبان سے سُنیئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، اس ضمن میں لکھا تھا کہ

جمہوری نظام

دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر، اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵۵)

اس اکثریت کی حکومت کے تابع مسلمانوں پر کیا گزرتی، اس کے متعلق، متحدہ قومیت کی سب سے بڑی مؤید جماعت

جمعیت العلماء ہند ـــ کے سیکرٹری، مولانا احمد سعید (مرحوم)، نے ۱۹۲۶ء میں کہا تھا کہ اسلامی حکومت کے زوال پر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا ـــ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے، حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔

(الجمعیۃ۔ بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم)، نے ۱۹۲۸ء میں، مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا:-

چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں، اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے۔" جو مظالم آئے دن یہاں دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں۔ اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا"، گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے، ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۴۲ء)

ہندوؤں کے عزائم

انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف، قائداعظمؒ نے، دسمبر ۱۹۴۱ء میں، آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا:-

ساورکر (صدر ہندو مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں۔ ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

(تقاریر قائداعظمؒ۔ جلد اوّل۔ ص ۵۶-۲۵۵)

یہ تھا وہ ہندو جس کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے، ملتِ اسلامیہ کے محسنِ اعظم محمد علی جناحؒ نے دس سال تک مسلسل لڑائی لڑی اور ہندو اور انگریزوں کے علاوہ، خود نیشنلسٹ مسلمانوں کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، پاکستان حاصل کر لیا۔ اس پر ہندوؤں کے دلوں کے اضطراب کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے

پاکستان بن جانے کے بعد

کہ ایک طرف، ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ کہہ رہا تھا کہ

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے

ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ (آرگنائزر ۲۴ء)

دوسری طرف دیوان چمن لال جیسے (بظاہر اعتدال پسند ہندو) یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہے تھے کہ

میں نا امید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے' اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہو گا کہ ہم (اپنی قوم کو) امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ (ایضاً)

اور تو اور، جب تقسیم ہند کا بل منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ اٹیلی (جو اس وقت میجر اٹیلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ

ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

پاکستان ـــ انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس سمجھوتہ کے ایک فریق (انگریز) کے خیالات سن لئے۔ اب کانگریس کی سنیئے۔ ۳۔ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا، اور ۱۶ ؍جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے، حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا:۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل، صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے، تقسیم ہند کے فیصلہ پہ دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پہ دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناحؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پہ یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(پاکستان فیسز انڈیا۔ ص ۹۹)

اس کے بعد راجہ مہندر پرتاپ نے (۱۹۵۰ء میں) اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابنفک ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

(دیر بھارت۔ ۱۲/۵)

سوشلسٹ اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج اور تعصب سے بالاتر قرار دیا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے، اس میں ہندو مہاسبھا اور سوشلسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ

ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائیگی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ اس باب میں "بڑے میاں" (مسٹر گاندھی) نے کیا دیا کھیان دیا ہے۔ وہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے تین دن پہلے کہا تھا کہ

اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے، ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔ (دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ صفحہ ۱۶۱ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لوبی)

کتابیں

(جو ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور ۱۱ سے بھی دستیاب ہیں)

نام کتاب	مصنف/مؤلف	صفحات	قیمت
۱۔ اشاریہ مجلہ طلوعِ اسلام	خادم علی جاوید	۵۴۰	۱۲۰،۰۰۰ روپے
۲۔ آیاتِ بیّنات	ثریا عندلیب	۳۱۲	۹۹،۰۰۰ "
۳۔ کُن فیکون	صابر صدیقی	۴۸۰	اخباری کاغذ ۱۲۰،۰۰۰ "
			سفید کاغذ ۱۵۰،۰۰۰ "
۴۔ مجلہ طلوعِ اسلام (مجلد)	ادارہ	۱۲ شمارے	۱۲۰،۰۰۰ "
۵۔ جنگِ خلیج کی تباہ کاریاں اور عالمِ اسلام کا مستقبل	محمد اشرف ظفر	۴۷۸	سٹوڈنٹ ۸۰،۰۰۰ "
			لائبریری ۱۳۰،۰۰۰ "
۶۔ رونا چھوڑیئے۔ جینا شروع کیجئے۔	مسز جان فردوس	۴۶۰	۱۵۰،۰۰۰ "
۷۔ غلام احمد پرویزؒ (ایک تعارف)	قاسم نوری	۱۲۸	۲۵،۰۰۰ "

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

عبداللہ ثانی

اسلامی ماہ و سال

جنوری ۱۹۹۳ء کا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی جنوری کے چند ہی دن گزرے ہیں۔ سال کے ختم ہونے میں پورے گیارہ ماہ اور چند دن باقی ہیں۔ ایک ایک لمحے سے ایک ایک ثانیہ، پھر ایک ایک ثانیے سے ایک ایک دقیقہ، ایک ایک دقیقے سے ایک ایک ساعت، ایک ایک ساعت سے دن اور رات، ایک ایک دن اور رات سے ایک ایک ہفتہ، ایک ایک ہفتے سے ایک ایک مہینہ، ایک ایک مہینے سے ایک ایک سال اور اسی طرح ایک ایک سال سے صدیاں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ جب سے یہ کائنات بنی ہے۔ یہ اوقات اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ کب تک جاری و ساری رہے گا۔ کرۂ ارض پر موجود اقوام نے ان سالوں اور مہینوں کو کسی خاص واقعے سے منسوب کر کے اپنی عددی صدیوں کا آغاز کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کا تعلق دن اور رات کے طلوع ہونے سے ہے۔ یعنی سورج جب طلوع ہوتا ہے تو نئے دن کا آغاز ہوتا ہے جس کا حساب کتاب رکھنا آسان ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنا سن وابستہ کر کے اُسے عیسوی بنا رکھا ہے۔ حالانکہ مہینوں کے نام یونانی ترجمہ شُدہ ہیں۔ اس لئے ان کے حساب میں غلطی نہیں آتی۔ اسی طرح ہندوؤں نے ہندوستان کے حکمران بکرماجیت کی وفات سے مہینوں کا حساب کتاب وابستہ کر کے بکرمی سن کا آغاز کیا ہے۔ ایرانیوں کا اپنا حساب کتاب کیا ہے اور وہ بھی سورج ہی سے وابستہ ہے۔ مسلمانوں سے پہلے عربوں کے ہاں بھی مہینوں کا تعین سورج کے طلوع و غروب سے ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی سن کا حساب نہیں رکھا صرف مہینہ آتا اور جاتا رہتا تھا اسی حساب سے موسم بھی تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ ہمارے ہاں جب سے تحقیق کرنا حرام قرار دے دیا گیا ہے اُس وقت سے کسی بھی چیز کے ساتھ لفظ اسلامی یا شرعی لگا کر اسے اسلامائز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ایسے سینکڑوں حقائق آج بھی موجود ہیں جن کا تعلق کسی صورت میں

بھی اسلام سے نہیں ہے۔ اگر اسلام کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ کی بعثت سے قبل اگر کوئی کام یا کوئی حقیقت موجود تھی تو اسے کسی طور پر بھی اسلام کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔

آیئے! قرآنِ کریم سے پوچھتے ہیں کہ چاند ہو یا سورج، اس کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ کیا ہے اور کتنا ہے؟ موضوع زیرِ عرض صرف اور صرف حساب کتاب تک مخصوص ہے اس لئے چاند یا سورج کی کسی دوسری ضرورت کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ سورج توبہ کی آیت نمبر ۳۶ ملاحظہ ہو۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ

(سورہ توبہ۔۳۶)

اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ کی ہے۔ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔

اس سے یقیناً ثابت ہوتا ہے کہ مہینوں کی یہ تعداد ہمیشہ سے ہی بارہ خود خداوند لم یزل کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔ ان مہینوں کو کسی سن سے وابستہ کرنا، پھر سن کا حساب رکھنا یہ انسان کا کام ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے ہمارے ہاں یعنی مسلمانوں نے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے وابستہ کردیا ہے اور یہ سعادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ چونکہ پیمانہ سورج ہی تھا، لہٰذا یہ طے پایا کہ ہمارا پیمانہ چاند ہوگا تاکہ خطِ امتیاز موجود رہے۔ حالانکہ خود عرب اپنے مہینوں کو سورج سے وابستہ رکھے ہوئے تھے۔ سخاوی نے اپنی کتاب "المشہور فی اسماء الایام والشہور" میں لکھا ہے کہ محرمؓ کے مہینے کو اس کی تعظیم کی وجہ سے کہتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک تو اس نام کی وجہ اس کی حرمت کی تاکید ہے۔ اس لئے کہ عرب جاہلیت میں اسے بدل ڈالتے تھے کبھی حلال کر ڈالتے کبھی حرام کر ڈالتے، اس کی جمع محرّمات، محارم، محاریم ہے۔ صَفر[2] کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینے میں عموماً ان کے گھر خالی رہتے تھے کیونکہ یہ لڑائی بھڑائی اور سفر میں چل دیتے تھے۔ جب مکان خالی ہوجائے، تو عرب کہتے ہیں، صفر المکان۔ اس کی جمع اصفار ہے۔ جیسے جمل کی جمع اجمال ہے۔ ربیعؓ الاول کے نام کا سبب یہ ہے کہ اس مہینے میں ان کی اقامت ہوجاتی تھی۔ ارتباع کہتے ہیں اقامت کو، اس کی جمع اربعاء ہے جیسے نصیب کی جمع انصباء اور اس کی جمع اَرْبِعَۃٌ ہے۔ ربیع الآخرؓ کے مہینے کا نام رکھنا بھی اسی وجہ سے ہے۔ گویا یہ اقامت کا دوسرا مہینہ ہے۔ جمادیؓ الاولیٰ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینے میں پانی جم جاتا تھا۔ ان کے حساب میں مہینے گردش نہیں کرتے تھے جیسے آجکل بھی عیسوی مہینے اس لئے گردش نہیں کرتے ہیں کہ ان کو سورج کے طلوع و غروب کے

ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں بھی ٹھیک ہر موسم پر ہی ہر مہینہ آتا تھا۔ لیکن یہ بات کچھ جچتی نہیں اس لئے کہ جب ان مہینوں کا حساب چاند سے وابستہ کر دیا ہے تو ظاہر ہے کہ موسمی حالت ہر ماہ پر ہر سال یکساں نہیں رہے گی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس مہینے کا نام جس سال میں رکھا گیا ہو اس سال یہ مہینہ کڑکڑاتے ہوئے جاڑے میں آیا ہو۔ اب اگر دسمبر یا جنوری کے مہینے کو چاند سے باندھ دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ یہی دو مہینے سخت گرمیوں میں آجائیں اس لئے کہ ایک سال میں چاند دس دن پیچھے چلا جاتا ہے۔ تین سال کے بعد یقیناً ایک ماہ کا فرق پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہی ہے کہ کبھی روزے سردیوں میں آتے ہیں اور کبھی سخت گرمیوں میں۔ حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ عیسائیوں یا ہندوؤں کا کوئی تہوار مقررہ مہینوں سے ہٹ کر کسی دوسرے مہینے میں آیا ہو۔ اسی طرح جمادی الاولیٰ جب کڑکڑاتے جاڑے میں آیا ہو اور پانی میں جمود ہو گیا ہو تو اس کا نام یہی پڑ گیا ہوگا۔ چنانچہ قبل از اسلام کے ایک "شاعر نے یہی کہا ہے کہ جمادی کی سخت اندھیری راتیں جن میں کتا بھی بمشکل ایک آدھ مرتبہ ہی بھونک لیتا ہے"۔ اس کی جمع جمادیات جیسے جباری اور جباریات۔ یہ مذکر مونث دونوں طرح مستعمل ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخرہ کہا جاتا ہے۔ جمادیٰ الاخری کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ گویا یہ پانی کے جم جانے کا دوسرا مہینہ ہے۔

رجبؔ، یہ ماخوذ ہے ترجیب سے۔ ترجیب کہتے ہیں تعظیم کو۔ چونکہ یہ مہینہ عظمت و عزت والا ہے اس لئے اسے رجب کہتے ہیں۔ اس کی جمع ارجاب، رجاب اور رجبات ہے۔ شعبانؔ کا نام شعبان اس لئے ہے کہ اس میں عرب لوگ لوٹ مار کے لئے اِدھر اُدھر متفرق ہو جاتے تھے۔ تشعب کے معنے ہیں جدا جدا ہونا۔ پس اس مہینے کا بھی یہی نام رکھ دیا گیا۔ اس کی جمع شعابین، شعبانات آتی ہے۔ رمضانؔ کو رمضان اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اونٹنیوں کے پاؤں بوجہ شدت گرما کے جلنے لگتے تھے۔ رَمَضَتِ الفِصَالُ اس وقت کہتے ہیں جب اونٹنیوں کے بچے سخت پیاسے ہوں۔ اس کی جمع رمضانات اور رماضین اور رامضہ آتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ یہ محض غلط اور ناقابلِ التفات قول ہے۔ شوال ماخوذ ہے شَالَتِ الْاِبِلُ سے۔ یہ مہینہ اونٹوں کی مستیوں کا مہینہ تھا۔ یہ دمیں اٹھا دیا کرتے تھے اس لئے اس مہینہ کا یہی نام ہو گیا۔ اس کی جمع شواویل، شواول، شوالات آتی ہے۔ ذوالقعدہؔ یا ذوالقعدہ کا نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس ماہ میں عرب لوگ بیٹھ جایا کرتے تھے نہ لڑائی کے لئے نکلتے اور نہ اور سفر کے لئے۔ اس کی جمع ذوات القعدہ ہے۔ ذوالحجہؔ کی ذوالحجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ اسی ماہ میں حج ہوتا تھا۔ اس لئے اس کا یہ نام مقرر ہو گیا۔ اس کی جمع ذوات الحجہ آتی ہے۔ اس حوالے سے قرآنِ کریم میں ایک اور آیت ملاحظہ ہو۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ

ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰/۵)

مفہوم:۔ یہ اُس خدا کا قانون ہے جس نے سورج کو ایسا درخشندہ اور چاند کو تابناک بنادیا اور چاند کی منازل مقرر کردیں تاکہ تم اس سے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ مبنی برحقیقت اور تعمیری نتائج پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ (نہ یہ محض "حلقۂ دامِ خیال" ہے اور نہ ہی اس کا انجام تخریب ہے۔ ہمارے تصوّف کی بنیاد اسی پر ہے جو ہم نے یونانی فلسفۂ تصوّف اور پھر ہندو دھرم کے تصوّف سے لیا ہے) اس نے اپنے قوانین وحقائق کو ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں کھول کھول کر بیان کردیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ سورۃ انعام آیت ۹۷۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝

مفہوم:۔ خدا کا یہی قانونِ گردش ہے جو رات کا پردہ چاک کرکے نورِ سحر کو نمودار کردیتا ہے اور اس طرح شب کی تاریکیوں کو دن کے اجالے میں بدل دیتا ہے۔ تم دن بھر کام کرتے ہو اس کے بعد وہ دن کے کاروبار پر رات کا پردہ گرا دیتا ہے اور تمہارے لئے آرام وسکون کا وقت آجاتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق چاند اور سورج اپنے اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح تمہارے لئے مہینے اور سال شمار کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ یہ سب اندازے اور پیمانے اس خدا کے مقرر کردہ ہیں جو ہر شے کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے اور ایسی زبردست قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی شے اس کے مقرر کردہ اندازے سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔

تیسرے مقام پر اسے یوں سمجھایا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۲۔

وَجَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝

مفہوم:۔ (یہ بات وحیٔ خداوندی بتاتی ہے کہ خیر اور شر کسے کہتے ہیں۔ ان کا باہمی تعلق کیا ہے

اور ان کی کشمکش میں خیر (نفع رسانی کی تعمیری) قوتیں کس طرح شر کی تخریبی قوتوں پر غالب آتی ہیں، مثال کے طور پر) دن اور رات کو دیکھو۔ یہ بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ایک ہی نظام کے دو پہلو ہیں۔ رات کی تاریکی (زمین کی گردش سے) مٹ جاتی ہے تو دن اپنی تابانیوں کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے تاکہ تم اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق تلاشِ معاش کر سکو۔ نیز تم (دن اور رات کے اختلاف سے) برسوں کی گنتی کر سکو اور اس سے ہر طرح کا حساب رکھ سکو۔

اس طرح ہم نے کائنات میں ہر شے کو ایک دوسرے سے الگ الگ رکھ چھوڑا ہے۔ (لیکن اس کے باوجود وہ ایک عظیم مشینری کے کل پرزے ہونے کی بنا پر باہمدگر پیوست بھی ہیں)۔

یہاں چونکہ انسان پرستاروں، برجوں اور دوسرے علم النجوم کے اثرات پر بحث مقصود نہیں جس کی قرآن کریم سخت مخالفت کرتا ہے۔ کسی دوسرے موقعہ پر اس کی تفصیل عرض کر دی جائے گی۔ صرف اور صرف سالوں، مہینوں اور صدیوں کے حساب کتاب رکھنے تک اس عنوان کو محدود رکھا گیا ہے۔ ایک آخری حوالہ دیئے بغیر بات ادھوری رہے گی ارشادِ خداوندی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ (۲/۱۸۹)

اے رسول (صلعم) تم سے چاند کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ ان سے کہو کہ یہ بنی نوعِ انسان اور مسلمانوں کے لئے اوقاتِ کار کا ایک آلہ ہے (جس سے ہر کوئی اپنا حساب کتاب رکھ سکتا ہے یعنی مسلمان اپنے مہینوں مثلاً حج وغیرہ کا تعین کر سکتے ہیں اور دیگر اقوام اپنے طور پر)۔

ان قرآنی حوالہ جات سے یہ بآسانی طے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا اسلامی ہونا یا نہ ہونا کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ یہ تو آلات ہیں۔ ان کے ذریعے اقوامِ عالم اپنے سال اور صدیوں وغیرہ کا حساب رکھ سکتے ہیں۔

یہاں ایک ہندوستانی مولوی صاحب کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا۔ جنگِ عظیم اوّل کے دوران ہندوستان میں گھڑیوں کو ایک گھنٹہ پیچھے کر دیا گیا تھا۔ یہ وقت کافی مدت تک جاری رہا۔ مسجدوں میں بھی گھڑیال لٹکے ہوئے تھے۔ بعد میں حکومتِ برطانیہ نے پھر اعلان کیا کہ اب گھڑیوں کو آگے کر دیا جائے۔ اکثر مولوی صاحبان نے اس کی مخالفت کی کہ یہ اسلامی وقت ہے ہم اسے کسی طور پر بھی چھیڑنا نہیں چاہتے۔ مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر انگریزی میل اور

شرعی میل میں فرق کے پسِ منظر کو کاٹتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فقہی رسائل و مقالات کے نادر مجموعہ جواہر الفقہہ کے صفحہ ۴۳۴ کا اقتباس پیشِ خدمت ہے۔

"انگریزی میل حسبِ تصریح چکر ورتی آٹھ فرلانگ کا ہوتا ہے اور ہر فرلانگ دو سو بیس گز تو انگریزی میل سترہ سو ساٹھ گز کا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دو سو چالیس گز بڑا ہے۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

"سفر شرعی کی مسافت کے تعین میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب مختلف ہیں جن کی تفصیل عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کی بھی اس بارہ میں روایات مختلف ہیں مگر راجح اور صحیح مذہب امام اعظمؒ کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جاوے بلکہ تین دن اور تین رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چل کر بآسانی طے کر سکے یا اونٹ کی سواری پر بآسانی طے کر سکے وہ مقدار مسافتِ سفر شرعی ہے۔ اور جب حسبِ تصریح ابن ہمام بیلوں کی سواری کا بھی یہی حکم ہے اور حسبِ تصریح بحر الرائق اونٹ سے بھی قافلہ کا اونٹ مراد ہے تیز رو سانڈنی مراد نہیں۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے سفرِ شرعی کی مسافت تین منزل قرار دی ہے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں کو کن کن طریقوں سے ان الجھنوں میں مصروف رکھا گیا تاکہ یہ ترقی کی کسی بھی منزل کی طرف آگے نہ بڑھ سکیں۔ چاند اور سورج کو اسلامی اور غیر اسلامی قرار دیا گیا۔ زندگی ہوئی تو اسلامی اور ان پر بھی کبھی قارئین کی خدمت میں مفصل لکھوں گا کہ ان تمام پیمانوں کو کبھی اسلامی اور کبھی غیر اسلامی قرار دیا جاتا رہا۔ حالانکہ یہ سب پیمانے نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایجاد ہوتے رہے ہیں۔ ہوا کے ناپنے کا پیمانہ غالباً بیرومیٹر ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ آلہ یا پیمانہ اسلامی ہے یا نہیں ــــ اور بس ــــ

اطلاعِ عام

یکم جنوری ۱۹۹۳ء سے ادارہ طلوعِ اسلام اور طلوعِ اسلام ٹرسٹ کے جملہ دفاتر برائے ہفتہ وار تعطیل بروز **ہفتہ** بند رہیں گے۔ احباب نوٹ فرمالیں۔

ناظمِ ادارہ و سربراہ ٹرسٹ

حقائق و عبر

سفارشی تبادلے

لاہور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس خلیل رمدے نے صوبائی محکمہ زراعت کے دو ملازمین کی جانب سے سیاسی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے تبادلے کروانے اور رکوانے کے اقدامات پر سخت نوٹس لیا ہے اور اپنے حکم میں ریمارکس دیئے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کا یہ حق ہی نہیں بلکہ ذمہ داری ہے کہ وہ انتظامی زیادتیوں کو روکیں اور پارلیمنٹ یا متعلقہ اسمبلیوں کے ذریعے غلط اقدامات کا ازالہ کریں۔

مسٹر جسٹس خلیل رمدے نے محکمہ زراعت کے جن دو ملازمین کی جانب سے سیاسی اثر و رسوخ کے استعمال کا نوٹس لیا ہے وہ گذشتہ سات ماہ سے اس کھیل میں مصروف تھے چھ ماہ میں دونوں کے ۹ مرتبہ تبادلے کے احکام جاری ہوئے۔ دونوں نے ایک رکن قومی اسمبلی اور ایک رکن صوبائی اسمبلی کا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ عدالت نے محکمہ زراعت کے ڈائریکٹر جنرل کو شوکاز نوٹس جاری کیا ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایڈمن کے خلاف کارروائی کرنے کی ہدایت کی۔ اس ایک واقعہ سے جو عدالتِ عالیہ تک جا پہنچا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرکاری محکموں کا کیا حال ہے، کارکردگی کیا ہے، اسمبلیوں کے ارکان کن کاموں میں مصروف ہیں اور سفارش کا چلن کیا ہے اس کے بعد اگر سرکاری دفاتر بھنگڑ خانوں میں تبدیل ہو جائیں تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ موجودہ حکومت کے دور میں رشوت اور سفارش جو گل کھلا رہی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، یہ صرف ایک محکمہ کا حال ہے ورنہ وابستگانِ اقتدار نے سفارش اور اثر و رسوخ کی بنا پر سرکاری دفاتر کی کارکردگی کو تباہ کر دیا ہے اور عوام اپنے مسائل اور مشکلات کے حل کے لئے سرکاری دفاتر کے چکر کاٹ کاٹ کر بالآخر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب تک سرکاری دفاتر کے معاملات میں سیاسی حلقوں کی سفارش کا راستہ قانوناً روکا نہیں جاتا اس قسم کی بدعنوانیوں کا ازالہ ممکن نہیں۔ (جنگ)

محاورۂ عرب

علامہ غلام احمد پرویزؒ نے قرآن فہمی کے لئے لغوی معنوں کے ساتھ ساتھ محاورۂ عرب جاننے کی ضرورت پر زور دیا تو ایک طوفان تھا جو اُن کے خلاف کھڑا کر دیا گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

درج ذیل اقتباس ماہنامہ اشراق، لاہور، بابت نومبر ۹۲ء سے لیا گیا ہے۔

"ہر زبان میں کثرتِ استعمال سے الفاظ میں ایسے معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو لغوی اعتبار سے ان کے اندر نہیں پائے جاتے۔ ہماری زبان میں اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ ہم ایسی ریل گاڑی کو، جو ہر سٹیشن پر رکتی ہے، پیسنجر ٹرین کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر اُس گاڑی کو پیسنجر ٹرین کہا جا سکتا ہے جس میں پیسنجر یعنی مسافر سفر کرتے ہیں۔ لیکن ہم ہر مسافر گاڑی کو پیسنجر ٹرین نہیں کہتے، بلکہ صرف اُس گاڑی کو پیسنجر ٹرین کہتے ہیں جو ہر سٹیشن پر رُکتی ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں پیسنجر ٹرین سے آیا ہوں، تو ہمارے ہاں ہر سننے والا بغیر کسی تردّد اور اشتباہ کے سمجھ لیتا ہے کہ اس جملے میں پیسنجر ٹرین سے مراد کون سی گاڑی ہے۔ گویا کثرتِ استعمال نے اِس لفظ میں ایک نئے معنی پیدا کر دیئے، جو لغت کے اعتبار سے لفظ کے ابتدائی مفہوم میں نہیں پائے جاتے تھے۔ مگر کسی اجنبی شخص کے لئے، جو زبان کے اس عرف اور روزمرہ سے واقف نہیں "پیسنجر ٹرین" کے صحیح مفہوم کو سمجھنا بڑی دقت کا کام ہے۔ اس کے سامنے جب یہ جملہ بولا جائے گا کہ میں پیسنجر ٹرین سے آیا ہوں، تو وہ اس کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے گا۔ عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اس قسم کی مشکلات دوسری زبانوں کی نسبت کچھ زیادہ ہیں، اس لئے غیر عرب، عربی دانوں کو انہیں سمجھنے کے لئے خصوصی محنت اور تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔"

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ

غلام رسول ازہر

آہ! بابری مسجد

اے خدائے ذُوالجلال و ذُوالمنن — ہم ہیں درماندہ، دریدہ جان و تن
کافرانِ ہند پھر یک جا ہوئے — پھر فسادِ کُشت و خوں برپا ہوئے
بابری مسجد تری برباد ہے — گھر چڑھ دوڑا بہم، فریاد ہے
تیرا گھر تیری نظر کے سامنے — کر گئے برباد کافر ہند کے
اے کہ تُو جبّار ہے، ذُوانتقام — اے کہ تُو قہّار ہے، اپنوں کو تھام
رُوحِ تیموری کو پھر آزاد کر — کافروں کو پھر سے تُو برباد کر
گورگاں سے پھر اُٹھے صاحبِ قراں — پھر پھریرا بابری لہرائے واں
پھر سے فرغانہ سے آئے اس کی آل — وہ ظہیر الدین بابر، پُرجلال
پھر سے عالمگیر محیُ الدین اُٹھے — بابری مسجد کا نوحہ گیں اُٹھے
پھر صلاحُ الدین ایوبی اُٹھے — افتخارِ شانِ محبوبیؐ اُٹھے
پھر اُٹھے غزنہ سے غازی کا قدم — غازیٔ محمود، سُلطانِ ہمم
پھر گریں بُت تا بحدِ سومنات — پھر سے دے کُفّار کو ذلّت کی مات
واسطہ تجھ کو رسُولُ اللہ کا — ہم میں بھی تو غیرتِ دینی جگا
عزم بُوبکرؓ و عُمرؓ، عثمان دے — دستِ حیدرؓ، جذبۂ ایمان دے
پھر سے سیفُ اللہ سے غازی بنیں — خالدِ جاں باز گھر گھر میں پلیں
شیر خواروں کو بھی سرداری ملے — جابروں کو ذلّت و خواری ملے
عسکری تیرے بنیں ہم سب کے سب — تیری رہ میں جان دیں ہم سب کے سب
ہم بنیں شہباز سب اقبال کے — نوچ کر کھائیں گرُو اور بال کے
رُوحِ قائد کو بھی ہم سے شاد کر — کُفر کو برباد کر، برباد کر

ہند پر پرچم اُڑے اسلام کا
سرنگوں ہو کُفر جب، وہ دن دِکھا

نقد و نظر

نام کتاب : احکام القرآن میں تحریف (مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" اور اصلاحی صاحب کی تفسیر "تدبرِ قرآن کا ناقدانہ جائزہ)۔

مصنف : پروفیسر رفیع اللہ شہاب ۔ ناشر : محمد عمر دراز، چیف ایگزیکٹو النور پرنٹرز و پبلشرز۔

ضخامت : ۳۵۷ صفحات ۔ قیمت ۔/۱۵۰ روپے، مجلد مع خوبصورت رنگین گرد پوش۔

جماعت اسلامی والے، مرحوم مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" کو عصرِ حاضر کی بہترین تفسیر قرار دیتے ہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس تفسیر کا اصل ماخذ کیا ہے اور مودودی صاحب نے کس طرح قرآنی احکام کی شکل بدل کر رکھ دی ہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب نے جو اپنے ابتدائی دور میں جماعت اسلامی سے منسلک رہے ہیں، اس تفسیر میں مولانا مودودی کی گنجلک تاویلات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے جو اس سے قبل طلوعِ اسلام میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے جسے مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد کتابی شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔

جماعت اسلامی کے ایک دوسرے اہم لیڈر امین احسن اصلاحی نے بھی قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی تھی۔ ایک عرصہ ہوا، وہ مودودی صاحب پر دشمنِ اسلام کا لیبل لگا کر الگ ہو چکے ہیں لیکن جب تک وہ جماعت سے منسلک رہے، جماعت کے لوگ انھیں مودودی صاحب سے بھی بڑا مفسرِ قرآن قرار دیتے رہے۔ لیکن جب انھوں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی، تو ان کی تفسیر کو مودودی صاحب کی تفسیر کی کاربن کاپی کہا جانے لگا اور حقیقت ہے بھی کچھ ایسی ہی۔ پروفیسر صاحب نے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں اصلاحی صاحب کی تفسیر "تدبرِ قرآن" کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

بظاہر یہ کتاب مودودی صاحب اور اصلاحی صاحب کی تفسیروں کا تنقیدی جائزہ ہے لیکن جیسا کہ اس کی فہرست مشمولات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا، اس میں اہم قرآنی احکامات کے بارے میں تفصیلی مباحث آ گئے ہیں۔ اس طرح ان مباحث کا مطالعہ، قارئین کی، قرآنِ مجید کے کئی ایک اہم مقامات سمجھنے میں رہنمائی کر سکے گا۔

کتاب النور پرنٹرز و پبلشرز اور مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار سے مل سکتی ہے۔

نام کتاب : اُخروی زندگی (قرآنِ حکیم کی روشنی میں)
تالیف : محمد عصمت ابو سلیم ایم۔اے ۔۔ ضخامت: ۲۵۵ صفحات ۔۔ قیمت : ۵۴ روپے۔
ملنے کا پتہ : فیصل برادران۔ لاہور و فاروقی کتب خانہ۔ الفیصل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے اللہ تعالیٰ، انبیاء، کتب، ملائکہ اور آخرت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب سلام کے سلسلۂ ایمانیات کی اہم ترین کڑی اُخروی زندگی اور پھر اس حوالہ سے قیامت سے متعلق ہے۔ حیات بعد الموت اور یوم القیامۃ کے متعلق قرآنی آیات اور تفسیری روایات کی تشریح و توضیح کے علاوہ امام رازی، امام غزالی، الکندی، الفارابی، ابنِ سینا، ابو العلا المعری اور ابو نواس جیسے فلاسفہ کی آراء کا تجزیہ کرنے کے بعد فاضل مؤلف اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قیامت اللہ کے حضور پیشی کا نام ہے نہ کہ فنائے عالم کا اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قیامت کے متعلق یہ عام تصور کہ اس کا قیام فنائے عالم سے وابستہ ہے، قرآنِ حکیم کی رو سے درست نہیں۔ اس سلسلہ میں مؤلف نے قریب قریب ان تمام آیات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر نہایت شرح و بسط سے پیش کیا ہے جن سے قیامت کا تصور فنائے عالم سے وابستہ بتایا جاتا ہے۔

حیات بعد الموت پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کے تصورات سے شدید اختلاف اور دیو مالائی کہانیوں کا ابطال کرتے ہوئے فاضل مؤلف نے خواجہ احمد دین امرتسری کی قرآنی فکر کو آگے بڑھایا ہے جس سے محض روایات و حکایات پر مبنی "موت کا منظر" جیسی کتابوں کے پھیلائے ہوئے توہمات دُور کرنے میں مدد ملیگی۔

دینِ مُلّا

دینِ حق از کافری رُسواتر است ۰ زانکہ مُلّا مومن کافر گر است
شبنمِ ما در نگاہ ما یم است ۰ از نگاہِ او یمِ ما شبنم است
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ۰ ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب ۰ کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد
(اقبالؒ ۔ جاوید نامہ)

نام کتاب : رہبر نظریہ مفرد اعضاء ، ترتیب و توضیح : حکیم محمد یٰسین، حکیم محمد شریف۔
ضخامت : ۳۰۴ صفحات، خوبصورت طباعت، خوشنما جلد، قیمت : -/۴۵ روپے
ملنے کا پتہ : یٰسین دواخانہ۔ دنیا پور، و دربار پلازہ لاہور۔

نظریہ مفرد اعضاء حکیم صابر ملتانی المعروف "حکیم انقلاب" کی فنی تحقیقات کا نتیجہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے دل، دماغ اور جگر کو عضلات، اعصاب اور غدد کے مراکز تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک جسم کی ساخت میں استعمال ہونے والا ہر ذرّہ اپنے اندر حرارت، قوت اور رطوبت رکھتا ہے جس کے اعتدال کا نام تندرستی ہے۔ نیز یہ کہ اعصاب اور دماغ کی کارکردگی رطوبت (بلغم) کی مرہونِ منت ہے اور عضلات و دل کا انحصار قوت (سودا) پر ہے۔ اس طرح غدود اور جگر کو اپنی کارکردگی کے لئے حرارت (صفرا) درکار ہے۔ گویا انسانی صحت کا راز ان تینوں خلطوں کے صحیح امتزاج پر ہے۔ یہ تینوں خلطیں بلغم، سودا اور صفرا روزمرّہ خوراک مہیا کرتی ہے۔ لہٰذا ان خلطوں کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوا سے زیادہ خوراک پر توجہ دی جائے۔ یوں تو جسم کا خود کار نظام اپنی طبعی حالت میں، اپنی ضروریات پوری کر کے فالتو بلغم، سودا اور صفرا از خود خارج کرتا رہتا ہے لیکن غیر متوازن غذا کا مسلسل استعمال جب اس نظام کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے تو خلطوں کی کمی بیشی سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں جن کے تدارک کے لئے سادہ سا اصول یہ ہے کہ غذا کے ردّ و بدل سے جو خلط بڑھ گئی ہے اسے کم کر دیا جائے۔ جسم میں کسی خلط کے بڑھنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جو غذا ہم لے رہے ہیں وہ اس خلط کی ضرورت سے زیادہ افزائش کا باعث بن رہی ہے اور دوسری صورت یہ کہ جسم سے اس خلط کا طبعی اخراج رک گیا ہے۔ علاج دونوں صورتوں میں غذا کے معمولی ردّ و بدل سے ممکن ہے جس کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

بیماریاں	بوجہ استعمال غذا از قسم	عارضہ	علاج بذریعہ تبدیلیٔ غذا
(دماغ و اعصاب) سے متعلق بیماریاں	"ترگرم" غذا	عدم اخراج	"ترسرد" غذا اخراج بحال کر کے بلغم کم کر دے گی۔
	"ترسرد" غذا	افزائش	"خشک سرد" غذا سودا پیدا کر کے بلغم کم کر دے گی
دل و عضلات سے متعلق بیماریاں	"خشک سرد"	عدم اخراج	"خشک گرم" غذا اخراج بحال کر کے سودا کم کر دے گی۔
	"خشک گرم"	افزائش	"گرم خشک" غذا صفرا پیدا کر دے کے سودا کم کر دے گی
جگر و غدود سے متعلق امراض	"گرم خشک"	عدم اخراج	"گرم تر" غذا اخراج بحال کر کے صفرا کم کر دے گی۔
	"گرم تر"	افزائش	"ترگرم" غذا بلغم پیدا کر کے صفرا کم کر دے گی

کتاب مذکور میں جہاں بیماریوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے وہاں مزاج کی نسبت سے غذاؤں کو بھی مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی روزمرہ غذا کا جائزہ لے کر اپنے لئے مناسب غذا خود ہی منتخب کر سکے۔ زیرِ نظر تبصرے میں ان غذاؤں کا ذکر تفصیل سے تو ممکن نہیں۔ تاہم قارئین کی دلچسپی کے لئے عام آدمی کی غذائیں اور ان کا مزاج کتاب مذکور سے اخذ کر کے درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ سرد خشک غذائیں (سرد زیادہ خشک کم)

حیوانی : مچھلی، دہی، زیادہ ترش دہی کی لسی ــ میوہ جات : مونگ پھلی، ناریل اور کھاجا۔

اناج : مکئی، باجرہ، جوار اور لوبیا ــ سبزیاں : آلو، مٹر، گوبھی، بینگن اور ہر ترشی۔

۲۔ خشک گرم غذائیں (خشک زیادہ گرم کم)

حیوانی : ہرن، کبوتر اور بھینس کا گوشت ــ میوہ جات : اخروٹ اور پستہ۔

پھل : انگور خشک، انجیر، آڑو شیریں ــ اناج : مسور اور چنے۔

سبزیاں : پالک، کریلے، ٹماٹر، کچنال، سرسوں کا ساگ اور پیاز۔

۳۔ گرم خشک غذائیں (گرم زیادہ خشک کم)

حیوانی : بکری، مرغ، بطخ، تیتر کا گوشت اور انڈے ــ میوہ جات : چلغوزے۔

پھل : آم شیریں، کھجور ترش و شیریں، خوبانی، آلو بالو اور شہتوت ــ اناج : چنے۔

سبزیاں : میتھی کا ساگ، ادرک، مرچ سبز اور لہسن۔

۴۔ گرم تر غذائیں (گرم زیادہ تر کم)

حیوانی : تیتر، بٹیر، مرغابی کا گوشت اور بکری کا دودھ ــ میوہ جات : بادام۔

پھل : انگور تازہ شیریں، امرود، خربوزہ اور میٹھا ــ اناج : گیہوں اور مونگ۔

سبزیاں : ٹینڈے، بھنڈی، گاجر اور حلوہ کدو۔

۵۔ تر گرم غذائیں (تر زیادہ گرم کم)

حیوانی : گائے کا دودھ، گوشت کوئی نہیں ــ میوہ جات : کوئی نہیں ــ پھل : ناشپاتی، کیلا، آلو بخارا

اناج : کوئی نہیں ــ سبزیاں : مولی، کدو، توری اور اروی۔

۶۔ تر سرد غذائیں (تر زیادہ سرد کم)

حیوانی : کوئی گوشت نہیں، بھینس کا دودھ ــ میوہ جات : کوئی نہیں ــ پھل : انار شیریں اور تربوز،

اناج : چاول، ساگودانہ اور انڈے کی سفیدی ــ سبزیاں : کھیرا، ککڑی، شلغم اور چقندر۔

قانون مفرد اعضاء طبِ یونانی، آیورویدک اور ایلوپیتھی سے قدرے مختلف ہے اور بالکل نیا ہے اس لئے کتاب میں طبیب حضرات کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات جمع کر کے ان کا مدلل جواب بھی دے دیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

کرامت اللہ خاں غوری
(کویت)

اقبالؒ کا شکوہ ۔ اپنی قوم سے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں (غالبؔ)

◆

تم کو دعویٰ ہے کہ اقبالؒ کے شیدائی ہو تم کو یہ زعم ہے کہ تم خوگرِ زیبائی ہو
تم سمجھتے ہو کہ تم وارثِ رعنائی ہو واہمہ تم کو ہے تم "حاصلِ صنائی" ہو
خود فریبی کے جہنم میں گرفتار ہو تم
نیک بنتے ہو مگر فاسق و بدکار ہو تم

کیوں گنہگار بنوں، آج حقیقت نہ کہوں جو گزرتی ہے مرے دل پہ قیامت، نہ کہوں؟
ہوں شب و روز گرفتارِ اذیت، نہ کہوں؟ بن گیا اپنے لئے دیدۂ حیرت، نہ کہوں؟
آج ہے یا کہ نہیں موقع محل، کہنا ہے
جو بھی کہنا ہے مجھے بانگِ دہل، کہنا ہے

میں نے پیغام تو کیا دیا، کیا تم نے سنا میں نے جو کچھ بھی کہا بن گیا صحرا کی صدا
ہر خوشی ایسی لٹی، نہ رہا کچھ نہ بچا اور بھی بڑھ کے ہوئے تم تو گرفتارِ بلا
کفر و ایماں کا، ہر اک فرق مٹایا تم نے
اپنے ہی نفس کو معبود بنایا تم نے

جاہ و دولت کا صنم میں سجایا تم نے ربِّ کعبہ کو ہر اک دل سے بھلایا تم نے
اپنا گھر اپنے ہی ہاتھ سے جلایا تم نے اپنے ہی ملک کو دوزخ بنایا تم نے
نے برباد کیا دین کا گہوارا بھی
نے تاراج کیا وقت کا شہ پارا بھی

میں نے جو خوابیں دیکھی تھی، وہ اک ملت تھی — جس کی تقدیر میں راحت ہی نہیں جنت تھی
جس میں وحدت تھی، اخوت تھی، حیا غیرت تھی — واقفِ حکمت و عظمت تھی، دلِ رحمت تھی

اپنے اطوار سے وہ خواب مٹایا تم نے
میرے افکار کو " قوالی " بنایا تم نے

خاص تھا، تم کو جو قدرت سے ملا تھا انعام — حیف صد حیف کہ تم نے نہ دیا اس کو مقام
تم تو قرآں کو بھی گاتے رہے ہر صبح و شام — کر دیا شیر و شکر تم نے حلال اور حرام

پھر بھی خواہش ہے کہ قدرت کی عطا ہو تم پر
رحمتیں رب کی برستی رہیں ہر شام و سحر

تم بتاؤ تو سہی ؟ کیا ہے کمایا تم نے؟ — جو بزرگوں سے ملا، وہ بھی بھلایا تم نے!
دیں کو بیچا کئے، مال بنایا تم نے! — اور قرآن کو جزداں میں سجایا تم نے!

ذلتیں کیوں نہ مقدر ہوں، ہر اک غم نہ ملے!
خود ہی انصاف کرو تم کو جہنم نہ ملے؟

قومیں ہوتی ہیں جو پیدا تو ابھرنے کے لئے — وہ بھنور میں بھی اترتی ہیں نکلنے کے لئے
اُن کا رُکنا بھی ہوا کرتا ہے چلنے کے لئے — وہ تو گرتی بھی اگر ہیں تو سنبھلنے کے لئے

تم کو لیکن نہ کبھی گر کے سنبھلتے دیکھا
ٹھوکریں کھاتے، جہنم میں ہی جلتے دیکھا

اب بھی یہ حال ہے، بس حرف زنی کرتے ہو — ہر برائی کو، شب و روز غنی کرتے ہو
ظلم کی چھاؤں کو، ہر آن گھنی کرتے ہو — اہلِ قرآن کی گردن زدنی کرتے ہو

تم میں غیرت کی کوئی بوند بچی ہے، بولو
تم میں عزت کی کوئی باس بسی ہے، بولو

ہر عمل میں ہی، ہوا کرتا ہے اس کا انجام — اس کی نظروں میں برابر ہیں سب خاص و عام
یہ جو تم آج زمانے میں ہو رسوا و بدنام — یہ مکافاتِ عمل ہے۔ نہ دو رب کو الزام

تم میں اوصاف کہاں ایسے کہ قدرت بخشے
اپنی رحمت میں جگہ دے تمہیں جنت بخشے

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی

ہمارا معاشرہ

رِستا ناسور

کیوں بنتا جا رہا ہے

جولائی ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں کسی صاحب نے سوال کیا تھا کہ ہماری قوم اس قدر جذباتی، زود رنج اور جلد باز کیوں واقع ہوئی ہے۔ جواب ہم نے قارئین پر چھوڑ دیا تھا۔ اسی دوران ماہنامہ "الفجر" کراچی میں صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "ہمارا معاشرہ رستا ناسور کیوں بنتا جا رہا ہے" نظر سے گزرا، جس میں مرض کی تشخیص انتہائی دلکش اور حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے۔ ماہنامہ الفجر کراچی اور صاحبِ مضمون کے شکریہ کے ساتھ ہم صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی صاحب کا یہ مضمون قارئین طلوعِ اسلام کے استفادہ کے لئے اپنے ہاں نقل کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

گذشتہ چند سالوں سے صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر "ذہنی بغاوت" کی راہ پر گامزن ہے، افرادِ معاشرہ اس راہ پر لگے ہوئے نہ مذہبی، دینی، قومی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی سنگِ میل بڑی بے دردی سے روندتے ہوئے برابر آگے بڑھ رہے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی سال بعد ایک اتھاہ گہری اور اندھی کھائی سامنے آئے گی اور پورا معاشرہ اس میں گر کر خودکشی کرے گا، بڑے بڑے مذہبی سیاسی لیڈر سے لے کر ایک عام کارکن تک اور کسی ارب پتی سے لے کر نانِ شبینہ کے محتاج تک کی نفسیات میں انارکی، تشدد، عدم برداشت، ہوس اور نفس پرستی کے اجزاء "غالب عنصر" کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ "ذہنی بغاوت" بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں بشرطیکہ اس کا حوالہ اور ہدف طے ہو۔ حوالہ اور ہدف کے بغیر یہ رجحان نرم سے نرم الفاظ میں خودکشی، انارکی

تباہی اور "گھر پھونک تماشا دیکھ" کا دوسرا نام ہے۔ حوالہ اور ہدف سامنے ہو یعنی پس منظر اور پیش منظر واضح ہو تو یہی ذہنی بغاوت ابراہیم علیہ السلام کو نمرودی معاشرے سے برسرِ پیکار کر دیتی ہے اور یوں "ملّتِ حنیف" سے دنیا روشناس ہوتی ہے۔

اسی ذہنی بغاوت کے سبب موسیٰ کلیم اللہ فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت غرقِ دریا کر دیتے ہیں اور یہی ذہنی بغاوت عالمِ انسانی کو جمود کے مقابلے میں اجتہاد، غلامی کے مقابلے میں آزادی، تمیز بندہ و آقا کے عہد میں مساواتِ انسانی، جبر و ستم کے زمانے میں آدابِ خود آگاہی اور جہالت و پسماندگی کے مدِّ مقابل سائنسی ترقی سے مالا مال کرتی ہے لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے کچھ ایسی دوڑ لگ گئی ہے کہ نہ باگ پر ہاتھ رہ گیا ہے اور نہ رکاب میں پاؤں، کوئی اس مُنہ زور گھوڑے کو تھامے تو کیسے؟

وہ دیہات جنھیں روایات کا امین سمجھا جاتا رہا ہے اب جہنم کا نقشہ پیش کر رہے ہیں، قتل، خونریزی، عصمت دری رہزنی، جہالت، انتقام، کینہ پروری، ایسے افعالِ قبیح دیہی تمدن کا تعارف بن گئے ہیں۔ رہے شہر جو تعلیم، تہذیب، شائستگی اور ترقی کا گہوارہ جانے جاتے تھے اب ان کے دامن میں اخلاق باختگی اور شوہدہ پن کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں، جوانی کے لبادے میں درندگی پل رہی ہے، خوف اور دہشت کا بھوت گھروں اور بازاروں کے منڈیر پر برابر محوِ رقص ہے، راتوں کو روشن ہونے والے چراغ اب دن کو جلانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ آدمی کو آدمی سجھائی نہیں دے رہا اور انسانوں کے انبوہ میں آدمی تنہا رہ گیا ہے۔ اگر درندوں کا غول انسانی بستی پر حملہ کر دے تو تشویش سب کو ہوتی ہے مگر تعجب کسی کو بھی نہیں کہ یہ عین ممکن اور متوقع ہوتا ہے مگر جب انسان، انسانوں کی بستی پر جبڑے تیز کر کے چڑھ دوڑیں تو یہ ہر امکان اور توقع کے برعکس ہوتا ہے، جب "انہونی" "ہونی" بنتی نظر آئے تو قیامت برپا ہونے میں کتنی دیر باقی رہ جاتی ہے؟ کچھ یہی نقشہ ہمارے معاشرے کا ترتیب پا رہا ہے، اس نقشے میں بھرے جانے والے رنگ سے کوئی کھال مست خوف محسوس نہ کرے تو اس کی مرضی ورنہ ہر وہ شخص جس کی عزت ہے، جس کے ہاں تصورِ عصمت ہے، جس کے گھر کا تقدس ہے، جس میں ابھی جوہرِ آدمیت ہے، جس کو اپنے آشیانے سے پیار ہے، جو زندگی کو بیگار نہیں مقدّس امانت سمجھتا ہے، جس کی آنکھوں پر چربی نہیں چڑھی، جس کے دل پر غلاف نہیں پڑا، جس کے کانوں میں کاگ نہیں اور جس کی ہر حس پر ہوس غالب نہیں آ گئی، وہ یہ سب کچھ لٹتا اور خاک میں ملتا دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جہاں سنگ و خشت سے آباد نہیں ہوتے بلکہ احساسات و جذبات کی گرمی ہی نبضِ جاں کو رواں رکھتی ہے اگر یہ احساس و جذبہ ہی سرد کر کوئلہ اور بے رمق ہو کر پتھر بن جائے تو شہر اور بن میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، دونوں جگہ ایک ہی مخلوق کا راج ہوتا ہے جسے ہم درندے کہتے ہیں۔

جس معاشرے کی مسجد اور بازار میں ایک ہی زبان استعمال ہوتی ہو۔ یعنی گالی کی زبان، جس کی منڈی میں ملنے والی

ہر چیز ملاوٹ زدہ ہو حتیٰ کہ جان بچانے والی دوائیاں بھی! جس سوسائٹی میں قانون کا نا ہو، ایک طرف سے آنکھ بند رکھتا ہو جہاں عدل کی ترازو بار بار زور اور زر سے جھکائی جاتی ہو، جس جگہ باڑھ کھیت چرنے کا شغل فرماتی ہو، جو دور اپنے دامن سے شریفوں کو جھٹکا دے کر باہر پھینک دیتا اور رذیلوں کو کنگرو کے بچے کی طرح اپنے سینے میں سموئے رکھتا ہے جس عہد میں انسان کے خون اور نالی کے پانی میں تمیز نہ رہ گئی ہو، شہر و دیہات میں نوکِ زباں نوکِ شمشیر بن گئی ہو، جہاں ہر نظر دوسرے کے لئے تیر کی انی ہو کر رہ گئی ہو، آنکھیں شعلہ بار اور ہاتھ دستِ قضا بن گئے ہوں تکلف برطرف ایسے معاشرے کو "رستا ناسور" کہنے میں کیا حرج ہے؟ کچھ منطقی مغالطے شاید ہمارا ساتھ نہ دیں لیکن "چشم دید" مشاہدے اس صورتِ حال کا انکار نہیں کر سکتے جس طرح حادثہ دفعتاً رونما نہیں ہوتا اسی طرح قوم و ملک بھی چشم زدن میں زوال آشنا نہیں ہوتے، کچھ علامات ظاہر ہوتی ہیں اور کچھ اسباب تشکیل پذیر ہوتے ہیں، علامات نوٹ کر لی جائیں تو علاج شروع ہو سکتا ہے، اسباب دُور کر دیے جائیں تو مرض رفع ہو سکتا ہے۔ ہر مرض "مرض مزمن" بننے سے پہلے یقیناً قابلِ علاج ہوتا ہے، بعد ازاں "مرضِ مزمن" مرض نہیں رہتا فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور اس کا کیا علاج، ہمارا ہنستا بستا ملک یکایک آسیب زدہ کیوں ہو گیا؟ روشنیوں کی بستی کراچی پر خون آشامی کی پان کیوں چڑھ گئی؟ وادیٔ مہران (سندھ) خطۂ قہرمان کیوں بن گئی؟ رشتے راستے کی دیوار کیوں بننے لگے؟ اصول امرِ فضول کیوں بن گیا؟ روایات ہماری نظر میں روایات کیوں ٹھہر گئیں؟ ہر اچھی قدر در بدر کیوں ہو گئی؟ کشادہ نظری کی جگہ کشیدگی نے کیوں لے لی؟ اہلِ مذہب غیر مہذب درس کیوں دینے لگے؟ سیاست کار فریب کار کیوں ہوئے؟ درس گاہیں قتل گاہیں کیسے بن گئیں؟ علم پر ظلم کیوں غالب آ گیا؟ قلم کی جگہ ہاتھ میں بیٹ اور بندوق کیوں آ گئے؟

یہ پاکستان کبھی ایسا تو نہ تھا، حضرتِ انسان کبھی ایسا تو نہ تھا، کچھ اسباب و عوامل ہیں جو میری سمجھ کے مطابق اس بیماری کی جڑ ہیں۔ اب بھی ہم پیچھے پلٹ سکتے ہیں، شاید کھویا ہوا سکون دوبارہ مل جائے۔ اب جس کو بڑے بوڑھے تو کیا بچے تک ترس گئے ہیں، آخر کب تک ماں باپ بچے کے اسکول سے گھر واپس آنے تک دروازے پر انتظار کرتے رہیں گے اور کب تک بچے کلاس روم سے ماں باپ کی گود تک کا درمیانی عرصہ خوف و دہشت کا شکار بنے رہیں گے؟ اہلِ نظر کچھ تو سوچا چاہیئے۔ ہمارے تجزیے کے مطابق اس معاشرتی بگاڑ کے چند اسباب یہ ہیں جنھیں ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ دوسرے اصحاب کسی اور پہلو سے اس کا تجزیہ کرتے ہوں گے۔ بیماری کی تشخیص ہو جائے تو علاج کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں! اللہ کرے کسی طریقے سے اس روگ سے میری اور اہلِ وطن کی جان چھوٹے!

معاشرتی بگاڑ کے اسباب و عوامل

۱۔ بے مقصدیت

انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ مکروہ اور ذلیل لفظ غلامی ہے کیونکہ غلامی کا مطلب جوہرِ آدمیت سے محرومی اور شرفِ انسانی کا فقدان ہے لیکن اہلِ نظر بے مقصدیت اور بے یقینی کو غلامی سے بھی زیادہ مہلک اور نقصان دہ قرار دیتے ہیں اور شومئی قسمت کہ یہی بے مقصدیت ہمارا شعار ہو کر رہ گیا ہے، مقصد خواہ امامتِ دنیا ہو یا فلاحِ اُخروی، پیشِ نظر کچھ تو ہونا چاہیئے۔ جس طرح پودے کے لئے گوڈی، کھاد اور پانی ضروری ہوتے ہیں اسی طرح صلاحیت کے اظہار کے لئے کسی مقصد اور ہدف کا ہونا ضروری ہے ورنہ پودا بھی سوکھ جاتا ہے اور صلاحیت بھی مرجاتی ہے، اس لئے ہر دور میں افراد اور اقوام اپنے لئے ایک مقصد متعین کرتے ہیں خواہ وہ جہانبانی ہو، اپنی قومیت کی حفاظت ہو، ایٹمی ترقی ہو، مادّی برتری ہو، علمی فضیلت ہو، جنگی صلاحیت ہو، ایٹمی طاقت ہو، سیاسی تغلب ہو، کچھ ہو لیکن یہ سبھی چیزیں ہمیز کا کام دیتی ہیں، ہر بڑا چھوٹا اپنے اوپر ایک دُھن سوار کر لیتا ہے اور سوتے جاگتے ایک ہی خواب دیکھتا ہے، اپنی زندگی میں مقصد پالیں، تو فھوالمراد ورنہ آئندہ نسلوں کے لئے ایک ورثہ، ایک سوچ، ایک ولولہ، ایک آرزو اور ایک جستجو چھوڑ جاتے ہیں اور ایسی قومیں یا افراد ہر عہد کی بدلتی کروٹ میں اپنے وجود، اپنی ہستی، اپنی شناخت اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

مگر ہم بحیثیتِ مجموعی ۱۹۷۰ء کے بعد بے مقصدیت کا شکار بن کر رہ گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی چنداں مقصد ہم پر غالب اور حاوی نہ تھا لیکن بے مقصدیت کی لہر اتنی تیز نہ تھی جتنی اب ہے بلکہ اب یہ لہر ایک سیلاب کی صورت اختیار کر گئی ہے جس میں ہر کہ دمہ تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہا ہے، ہمارے بڑے بوڑھوں کے ریشے تو پھر بھی ماضی کے ماہ و ایام میں کسی حد تک پیوست ہیں مگر نسلِ نو اپنی کھونٹی سے رسّے تڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی ہے ایک دھما چوکڑی ہے جس کے شور سے ہر شریف انسان اپنے کانوں میں انگلی ٹھونسنے پر مجبور ہے۔

ہم اپنے اندر نہ یہ تڑپ رکھتے ہیں کہ ہمارا ملک خوشحال ہو، قرضوں سے نجات پائے، سیاسی استحکام حاصل کرے، خود کفیل ہو، ایٹمی طاقت بنے، علاقے کے فوجی اور سیاسی توازن میں اپنا کردار ادا کرے، اقتصادی غلامی سے چھٹکارا پائے، اور نہ یہ آرزو ہے کہ ہماری انفرادی زندگی دیانت، امانت، شرافت، عدالت، مروّت، ایسے جواہر سے تابدار ہو، نہ یہ ولولہ ہے کہ ہم اپنے ملک اور اپنی ذات کو دنیا بھر کے لئے قابلِ رشک بنائیں اور نہ یہ سوچ ہے کہ چار دن کی چاندنی کے بعد گھُپ اندھیرا آنے والا ہے اور سوائے خدا کی ذات کے کوئی مونس و غمخوار نہیں ہوگا کچھ اس دن کی تیاری

کر لیں کہ جب وہ طلوع ہوگا تو تیاری کی مہلت ختم ہو چکی ہوگی۔

ہمارے شوق اور جذبے لے وقف ہیں ہڑتالیں کرنے، جلوس نکالنے، بسوں، ویگنوں اور کاروں کے شیشے توڑنے کے لئے، ساری تدبیریں ہوتی ہیں ملاوٹ کے مختلف طریقے ایجاد کرنے، امتحانات میں نقل کرنے، جعلی پاسپورٹوں کے ذریعے بیرونِ ملک جانے، غبن اور پلاٹوں پر قبضے کرنے کے لئے!

اسی بے مقصدیت کا ایک اور مظہر یہ ہے کہ نسلِ نو اپنے آئیڈیلز بدل رہی بلکہ بدل چکی ہے۔ اب اس کے لئے طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، سراج الدولہ، سلطان ٹیپو، ڈاکٹر عبدالقدیر، عبدالستار ایدھی، کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اب ہر نوجوان کرکٹر، گلوکار اور ہم جو بننے کی دھن میں مبتلا ہے، ہر کوچہ و بازار کرکٹ گراؤنڈ اور گھر کے کمرے فلم اسٹوڈیو کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ کوئی کرکٹر نہ ہو، اداکار نہ بنے، گلوکار پیدا ہی نہ ہو مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ پوری قوم کرکٹر بن جائے، ہر ایک اداکار ہو، سب کے سب گلوکار قرار پائیں۔ ہر چیز اپنے صحیح تناسب کے ساتھ اچھی لگتی ہے۔ یہ مشغلے شاید بہت ضروری ہوں مگر تعلیم، تربیت، ادب، سائنسی ترقی، اعلیٰ اقدار اور روحِ اسلامی اور شرفِ انسانی کا قطعاً متبادل نہیں بن سکتے، جو قوم بیٹ بلے اور فیشن کی جنگ جیتنے پر تُل جائے، اس سے بڑھ کر بے مقصدیت اور کیا ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ آج ملک میں اشیائے ضرورت کی دکانیں، اخباروں کے اسٹال اور کتابوں کے شوروم بہت کم لیکن ہر کارنر پر بیوٹی سپاٹ، سلمنگ سینٹر، بیوٹی پارلر، بوتیک اور میوزک شاپس ضرور موجود ہوں گے، یہ روز افزوں رجحان کم سے کم ہمارے ذہنی افلاس کی چغلی ضرور کھا رہا ہے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور رفتہ رفتہ کہاں تک آ پہنچے ہیں، اگر یہ سب کچھ محض تفریحِ طبع کے لئے ہو تو چنداں قابلِ اعتراض نہیں لیکن یہ شوق ہمارا روگ اور خبط بنتا جا رہا ہے اور یہ تو طے ہے کہ روگی اور خبطی لوگ معاشرے میں مثبت رویوں کو فروغ نہیں دیتے، یہ جنون بسا اوقات منفی ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے اور اس کے کرشمے اور مظاہر آئے دن جرائم اور تشدد کی شکل میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مذہب[1] سے بیگانگی اور بیزاری

یہ کہنے کی جسارت کروں تو مجھے قابلِ معافی سمجھا جائے کہ آج بغیر کسی دلیل، بنیاد اور جواز کے مذہب سے بے زاری ایک فیشن سا بن گیا ہے، مذہب چونکہ انسان کو بعض حدود کا پابند، سنجیدہ، مثبت طرزِ عمل اور عادات و اطوار میں ایقان و پختگی کا عادی بناتا ہے اور ہم ٹھہرے ہر حد و قید کو توڑنے والے، کھلنڈرے، منفی رویوں کے رسیا اور یقین و استحکام

---

[1] طلوعِ اسلام، مذہب کی جگہ "دین" کی اصطلاح بامعنی ہوگی۔

سے خار کھانے والے اس لئے سرے سے مذہب سے برگشتگی ہی کو اپنا طرۂ امتیاز اور فیشن بنالیا ہے کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری، صرف ایک لمحے کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے تو یہ فقرہ کہنے کی اجازت اہلِ یورپ کو تو دی جاسکتی ہے جنھوں نے مذہب سے الگ ہو کر دنیا میں معیشت اور سائنس کے اعتبار سے ترقی کی ہے (اگرچہ ترقی کا یہ مفہوم میری نظر میں محلِ غور و فکر ہے)۔ ظاہری چمک دمک کے عوض یورپ نے جو اپنے باطن کو تاریک سرنگ بنا دیا ہے، جہاں وہ اب خود کو بھی نہ ڈھونڈھ سکتا ہے اور نہ پہچان سکتا ہے، تو یہ کوئی ترقی نہیں، تاہم برائے بحث یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہم یہ جملہ کس مُنہ سے ادا کرتے ہیں کہ مذہب چھوڑ کر ہمیں بجز آوارگی انارکی، تشدد، اخلاقی و معاشرتی کرپشن، اصول و اقدار کی پامالی، فرسٹریشن اور نفس پرستی کے کیا نصیب ہوا ہے؟

اصل میں ہم سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ مذہب کو بعض اداروں اور افراد کے ذریعے سے جانچا اور پرکھا اور ہم ٹھوکر کھا گئے۔ ان اداروں یا افراد کی بعض کوتاہیاں ہمارے لئے نیچے اُترنے کی سیڑھی بن گئیں اور پھر ہم نیچے اترتے ہی چلے آئے اور پاتال میں جا گرے۔ اگر مذہب کو ہم اللہ و رسول اور عرفانِ ذات اور شعورِ خودی کے حوالے سے دیکھتے تو مذہب ہماری خارجی نہیں بلکہ اندرونی ضرورت محسوس ہوتا اور ہم اس سے گریز کا راستہ نہ نکالتے۔ ہم بدقسمتی سے سمجھ بیٹھے کہ سوسائٹی اور مذہب، ذات اور اجتماع، فرد اور ملت، جسم اور روح، دماغ اور دل، تصور اور عمل، یہ سب مختلف چیزیں ہیں حالانکہ ان ہر دو کا آپس میں پھول اور خوشبو، سورج اور کرن، پانی اور نمی اور ناخن اور گوشت کا تعلق ہے جو کسی صورت میں ایک دوسرے سے نہ مختلف ہے اور نہ جدا ہو سکتے ہیں اور کسی مصنوعی عمل کے ذریعے انہیں الگ کر دیا جائے، تو ایک نہ ایک چیز کی نفی ہو جائے گی، یعنی پھول ہو اور خوشبو نہ ہو تو پھول بے معنی رہ جاتا ہے، کرن کا سورج کے بغیر تصور ہے؟ پانی ہے تو نمی ہوگی اور ناخن کو گوشت سے جدا کر دیا جائے، تو کتنی تکلیف ہوگی غرضیکہ مذہب (دین) ذات اور اجتماع، فرد اور ملت، جسم اور روح، دل اور دماغ اور تصور اور عمل کے درمیان واسطہ اور رابطہ ہے جس طرح حیاتِ طبعی کے ہر رگ و ریشے میں پانی موجود ہے اسی طرح حیاتِ معنوی میں مذہب کارفرما ہے، اس کو درمیان سے نکال دیا جائے تو ذات کی نفی ہوگی یا اجتماع کو چھوڑنا پڑے گا یا فرد مجروح ہوگا یا پھر ملت برباد ہوگی، ایک نہ ایک چیز سے ہاتھ دھونا پڑے گا، یورپ نے ایک چیز کو شعوری طور پر چھوڑا اگر ایک اس کے ہاں رہ گئی مگر ہماری مذہب سے بیگانگی یا برگشتگی چونکہ کسی دلیل کے بغیر محض چلتے فیشن پر مبنی ہے اس لئے ہمیں دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، نہ ذات کا تشخص باقی رہا اور نہ اجتماع کا وقار بچ سکا ہے نہ ہم اپنا ظاہر سنوار سکے ہیں اور نہ باطن صیقل ہو سکا ہے۔

کوئی آدمی فقط شوقِ بحث پورا کرنا چاہے تو اس کی مرضی ورنہ مذہب انسان کو مہذب بنا دیتا ہے، خدا سے

تعلق انسان کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہونے دیتا جو ائے نصیب ہم ایک دوسرے سے ہوتے جا رہے ہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت آدمی کو آدابِ انسانیت سکھا دیتی ہے، احکامِ الٰہی کی بجا آوری افراد کو منضبط اور مربوط شخصیت کا حامل بنا دیتی ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ محض مراسم نہیں، زندگی کے سفر کے تربیتی مراحل ہیں۔ بندہ اگر انہیں مکمل شعور و آگہی کے ساتھ ادا کرے تو اندر سے ایک شاندار اور محبوب انسان جنم لیتا ہے۔

آخرت کی جوابدہی کا احساس لوگوں کو شترِ بے مہار نہیں بننے دیتا اور تکلف برطرف ہم "بے مہارے شتر" نہیں بن گئے کہ جو جس طرف چاہے منہ اٹھائے چل دیتا ہے، راستے میں کوئی قدر، کوئی حد، کوئی قانون، کوئی معیار، کوئی اصول آجائے تو لتاڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

مذہب کا تاثر فرد اور معاشرے کے اندر جتنا گہرا ہوگا نا اُمیدی اور مایوسی کا وہاں گزر تک نہ ہوگا، فرسٹریشن ایسے امراض کا تعلق انسان کی عجلت پسندی سے ہوتا ہے کہ اگر اتنے وقت کے اندر خواہش کے مطابق یہ کچھ نہ ہوا تو آدمی زندگی سے اکتا جاتا ہے جب کہ مذہب انسان کو آخرت کا تصور دے کر سفرِ حیات کو مسلسل اور وسیع بنا دیتا ہے جس کے نتیجے میں آدمی بچگانہ روش کے بجائے ذمہ دارانہ انداز اپناتا ہے کیونکہ وہ سمجھ جاتا ہے کہ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

یہ وہ مایوسی اور فرسٹریشن ہے جو آدمی کو اپنی زندگی سے بیزار کر دیتی ہے اور اس کی نظر میں زندگی اپنی معنویت اور کشش کھو دیتی ہے جس کے نتیجے میں انسان خود کو اپنے لئے اور دنیا کے لئے بوجھ سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور بالآخر یا تو آدمی خودکشی کر لیتا ہے یا پھر خودکشی سے پہلے وہ مردم کشی پر تل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ جب میرے لئے اس دنیا میں کوئی مصرف، کوئی خوشی اور کوئی جاذبیت نہیں تو دوسرے بھرپور اور پُرتکلف زندگی کیوں بسر کریں؟ اس طرح سے ایک جنون، ایک انتقام اور ایک خون آشام رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مذہب آدمی کے سامنے کائنات کا بامعنی تصور، زندگی کا حسین تجربہ، شخصیت کا پیداواری پہلو اور آخرت کا ایک خوبصورت عقیدہ پیش کرتا ہے جس سے ذہن میں پرورش پانے والے مفسد جراثیم، سوچ کے منفی زاویے، مردم بیزاری کا انتقامی جذبہ اور نفس پرستی و خود غرضی کا مکروہ مواد خود بخود تحلیل ہو کر آدمی صحیح معنوں میں آدم زاد اور انسان حقیقی طور پر انسانیت نواز بن جاتا ہے۔

اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو مذہب سے گریز اور بیزاری ہمارے معاشرے کے بگاڑ کا ایک قوی اور اہم عامل ہے۔

نفاذِ قانون میں طبقاتی امتیاز

ہمارا معاشرہ تشدد اور انتقام کے جس خونی چکر میں تیزی سے پھنستا چلا جا رہا ہے اس کا ایک سبب نفاذِ قانون

میں طبقاتی امتیاز کا رویّہ ہے، ہمارے ہاں قانون جیسا بھی ہے بہرکیف اس کا مقصد جرائم کا خاتمہ اور انارکی کا قلع قمع ہے مگر بدقسمتی سے قانون اپنے جملہ الفاظ و تراکیب کی خوبصورتی کے باوصف وہ کچھ نہیں کر پا رہا جو اس کی تدوین اور تنفیذ کا مقصدِ واقعی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی میں دو طبقات ہیں۔ ایک وہ جو قانون کی چکّی میں پستا ہے اور دوسرا جو خود قانون کو پیستا ہے، جہاں ایسی دوعملی ہوگی وہاں سب سے زیادہ مظلوم اور قابلِ رحم خود قانون ہوگا۔ وہ قانون ہی کیا جو کسی کا چہرہ، کسی کا شجرۂ نسب، کسی کا اشارۂ ابرو، کسی کا سیاسی منصب، کسی کا جاہ و جلال اور کسی کی ذات برادری دیکھے، قانون تو ایسی بالاتر میزان ہوتی ہے جہاں سب کی بالاتری اور کمتری ایک باٹ تُلتی ہے، معزز صرف وہی ہوتا ہے جسے قانون بے گناہ قرار دے دے۔ اس کائناتِ انسانی میں کون مائی کا لال ہے، خواہ وہ دارا و سکندر ہو یا تیمور و چنگیز، لودھی ہو یا غزنوی، بلبن ہو یا خلجی، جاٹ کہلاتا ہو یا گجر، صدر ہو یا گورنر، چوہدری صاحب ہو یا پیر صاحب، جو خود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ معتبر سمجھتا ہو یا دنیا کا کوئی فرد اسے معزز گردانتا ہو اس آسمانِ نیلگوں کے نیچے اور دھرتی کے سینے پر ایسا کوئی بھی نہیں، نہ بزعمِ خویش اور نہ بہ گمانِ دیگر، لیکن پیغمبرِ خدا اپنی اس تمام تر جلالت، عظمت، عصمت، تمکنت اور تقدس کے باوجود خود سب سے بڑھ کر قانون کی پابندی کرنے والے اور اپنے اوپر قانون کو نافذ کرنے والے تھے اور انھوں نے دنیا بھر کو یہ انقلابی اور عبرت آموز درس دیا کہ

"تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان کا چھوٹا کوئی جرم کرتا تھا تو وہ قانون کے مطابق سزا کا مستحق ٹھہرتا مگر ان کا بڑا قانون کے دائرے سے آزاد سمجھا جاتا تھا۔"

ہمارا معاشرہ اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ گو اور امتی ہے مگر رویّہ اور طرزِ عمل یہ ہے کہ ہر شخص قانون کو لتاڑنا اور غچّہ دینا فن اور عزت سمجھتا ہے جب کہ باشعور معاشرے میں طاقت ور وہ ہوتا ہے جو قانون کا پابند ہو اور کمزور وہ جو قانون شکنی کرتا ہے کیونکہ قانون شکن کے لئے معاشرے کے اجتماعی ضمیر میں کہیں بھی جائے پناہ نہیں ہوتی اور وہ خود کو تن تنہا اور بے یار و مددگار سمجھنے لگتا ہے۔

ہمارے یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے صدر سے تحصیلدار تک یہ باور کر بیٹھے ہیں کہ اگر ہمیں قانون کی پابندی ہی کرنا تھی تو پھر صدر، وزیراعظم، وزیر، گورنر، سیکرٹری، کمشنر، تحصیلدار اور تھانیدار بننے کی کیا ضرورت تھی؟ قانون رعایا کے لئے ہوتا ہے حاکموں کے لئے قانون چہ معنی دارد؟ چنانچہ آئین تک میں اپنے لئے تحفظات پیدا کر لئے گئے اور یہ امر اپنے لئے انتہائی توہین آمیز فرض کر لیا گیا کہ ہم اور عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں؟ ہم اور ہمارے خلاف قانونی چارہ جوئی ہو؟ ہم اور ہمارے خلاف ایف آئی آر درج ہو؟ ہم اور ہمارے اعمال و احوال کی بازپرس ہو؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، ہمارے بڑوں کی یہ سوچ جرائم کی پرورش کے لئے گویا ایک نرسری ہے، جب کوئی غریب کمزور اور عام

آدمی اپنی آنکھوں سے افسروں کی بدمعاشیاں، اربابِ زر و جاگیر کی عیاشیاں اور ان کی بدمست اولاد کی خرمستیاں دیکھتا ہے تو اگر وہ پتھر اور لوہے کا بنا ہوا نہیں، تو یقیناً ان کرتوتوں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور منفعل اور مشتعل بھی، اور ویسا ہی قانون کی بے احترامی کا رجحان اس کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے، تاہم جب قانون کے نفاذ کا مرحلہ آتا ہے تو بگڑے ہوئے افسر اور امیرزادے ہر گرفت سے آزاد اور ویسے کے ویسے معزز ہوتے ہیں اور غریب کا بیٹا ہتھکڑیوں سمیت عدالت کے کٹہرے میں قید بامشقت کی سزا سُن رہا ہوتا ہے، معمولی سپاہی اور پٹواری رنگے ہاتھوں ساٹھ روپے لیتا ہوا پکڑا جاتا اور اس کی مائیں بہنیں اور بیٹیاں تک تھانے کی حوالات میں پہنچ جاتی ہیں اور افسرانِ کرام، وزرائے کرام، اور ممبرانِ کرام کروڑوں روپے ہضم کر جائیں، غریب دہقان کی عزت تار تار کر دیں، بستی کی بستیاں اجاڑ ڈالیں، بھرے بازار اور معروف چوک میں دسیوں انسانوں کو بھون ڈالیں تو قانون بے چارہ دانتوں میں انگلی دبائے شرم سے سر جھکائے اور بے بسی سے مُنہ لٹکائے سراپا استفسار ہوتا ہے "بتا تیری رضا کیا ہے؟"

ایسے ماحول میں کوئی فلاسفر، کوئی تجزیہ نگار اور کوئی واعظ اور ناصح بے روزگار نوجوانوں، جو ہر یوں کے ستم رسیدہ دہقانوں، افسروں کے زخم خوردہ سائلوں، حکمرانوں کے کرتوتوں سے بے زار ماتحتوں، زمینداروں سے اکتائے ہوئے کاشتکار کے بیٹوں سے یہ توقع رکھے کہ وہ شعور، علم، صبر، بردباری اور دیانتداری کا مظاہرہ کریں تو

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

جب حاکمانِ وقت اور ان کے لاڈلوں اور حواریوں کو خدا کی تمام نعمتیں ملنے کے باوجود شعور نہیں آتا، علم ان کی فطرت میں نہیں، صبر کا لفظ انھوں نے پڑھا ہی نہ ہو، بردباری انھیں چھُو کر نہ گئی ہو اور دیانتداری سے بیگانہ محض ہوں تو تنگ گلیوں میں پلنے والے، نانِ شبینہ کو ترسنے والے، ہر موڑ پر عزتِ نفس گنوانے والے، قدم قدم پر اپنی عزت اور خودی کو نیلام ہوتا دیکھنے والے اور در بدر ٹھوکریں کھانے والے کیسے ان فلسفیانہ تصورات سے آگاہ ہو سکتے ہیں؟

نو دولتیا طبقہ

ہمارے معاشرتی بگاڑ میں نو دولتیا طبقے کا مزاج اور کردار بھی خاصا اہم ہے، جسے نظر انداز کر کے ہم شاید اس حساس مسئلے کا ہمہ جہتی تجزیہ نہیں کر سکے۔ یہ طبقہ بہت ہی قلیل مدت میں اُبھرا ہے مگر اس نے پورے معاشرتی ڈھانچے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ پشتینی جاگیردار اور روایتی سیٹھ اور سرمایہ دار صدیوں سے ہمارے ہاں موجود ہیں اور ان کی خرابیاں بھی محتاجِ بیان نہیں، تاہم وہ لوگ برسہا برس سے اس عمل کا حصہ ہیں، چنانچہ کچھ روایات، کچھ قدریں اور کچھ تقاضے ان کے ہاں بڑے اہتمام سے ملحوظ رکھے گئے جس سے معاشرہ عمومی بگاڑ، بناوٹ، نمائش اور اتھلے پن کا شکار نہیں ہوا لیکن نو دولتیا طبقہ چونکہ کسی عمل کا حصہ نہیں بلکہ بعض اتفاقات اور عاجلانہ

اقدامات کے ذریعے بہت تھوڑے وقت میں مستحکم اور متعارف ہوا ہے اس لئے اسراف، تبذیر دولت کی نمائش فیشن پرستی، عہدے کے حصول کی آس اور اقتدار اور روایات کے خلاف بغاوت کی کیفیات ہمارے معاشرے کے معمولات میں شامل ہوگئیں جس سے گویا ایک فلڈ گیٹ کھل گیا اور ہر کس و ناکس اس کے بہاؤ کی نذر ہو گیا نو دولتیا طبقہ کسی عملی صلاحیت، فنی قابلیت اور ذہنی مہارت کے باعث وجود میں نہیں آیا بلکہ اسمگلنگ، ملاوٹ رشوت، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، چھینا جھپٹی، منشیات کی تجارت اور اس طرح کے دیگر ذرائع کے بل بوتے پر دیکھتی آنکھوں زر و جواہر میں کھیلنے لگا ہے اس لئے وہ صبر و تحمل، برداشت، میانہ روی، قناعت، وقار اور غنا ایسے اوصاف اپنے اندر پیدا نہیں کر سکا اور نہ وہ اپنے مخصوص مزاج کے باعث پیدا کر سکتا تھا، اس کا اثر یہ ہوا کہ شادی ہو یا مرگ، مکان کی تعمیر ہو یا دفتر کا قیام، لباس کی تراش خراش ہو یا طرزِ بود و باش، ہر ایک حوالے سے ایک چھچھورپن پیدا ہوتا چلا گیا، معاشرے میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو ہر عمل اور ردِ عمل کو اس کے پورے نظام کے ساتھ منسلک کر کے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہوں اور وہ اس تصنع اور بناوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ چنانچہ ہر آدمی انھیں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگ گیا اور عالمِ تصور میں خود کو ویسا ہی دیکھنے کی آرزو کرنے لگا، ایک دن میں مہنگا پلاٹ خریدا، چوتھے روز بنگلہ تیار ہو گیا، گھروں میں ٹی وی فریج، وی سی آر، قالین، صوفے اور سامانِ آرائش کی بھرمار شروع ہو گئی، ملبوسات کے نئے سے نئے ڈیزائن وجود میں آنے لگے، جدید ترین ماڈل کی گاڑیاں گیراج میں پہنچ گئیں، بھاری اور قیمتی زیورات پہن کر جانا ہر محفل اور تقریب کے آداب میں شامل ہو گئے، ہزاروں روپے کے عروسی جوڑے اور کامدار ساڑھیاں ضرورت کا درجہ اختیار کر گئیں، شادی بیاہ اور روزمرہ کی دعوتوں کے لئے اونچے اور مہنگے ہوٹلوں کا رُخ کرنا فیشن سا بن گیا اور ہر شریک محفل کے سامنے اپنی دولت و امارات کا اظہار ایمان اور عقیدہ بن گیا۔ ایسے میں جو متوقع تھا وہ سامنے لگ گیا کہ شخص وہ کچھ کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا جو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا یعنی فیشن، آسائش، آرائش، طمطراق اور نمائش! اب ضروری تو نہیں کہ ہر اندھے کے ہاتھ میں بٹیر آ جائے، بس ایک دوڑ سی لگ گئی، اور اس دوڑ میں سارے رشتے ناطے پامال ہونے لگے، چار دیواریاں پھلانگی جانے لگیں، راستے غیر محفوظ ہونے لگے پستول تان کر چچا اور ماموں کی جیب صاف ہونے لگی، ملکی سرحدیں اپنی تقدیس اسمگلنگ کے باعث گنوا بیٹھیں، القصہ ہر شخص ایک ہی خواب دیکھنے لگا، بنگلہ، کار، صوفہ، فریج، ٹی وی، وی سی آر، فیشن، ہوٹلنگ، یہ خواب تو بلاشبہ سہانا اور دلکش ہے مگر تعبیر سامنے آئی تو بڑی بھیانک، خوفناک، تاریک اور مہلک تھی، وہ جو ایک محاورہ ہے "سائے سے ڈرنا" اس وقت بلاشبہ ہر انسان اپنے سائے سے ڈر رہا ہے، جہاں سائے ڈرانے لگیں وہ معاشرہ انسان کے لئے معاشرہ نہیں ایک مستقل "محاصرہ" بن جاتا ہے جس کی دیواروں سے آسیب چمٹے ہوں اور منڈیر پر بھوت منڈلاتے ہوں۔ کوئی ایسا ہے جو اس مشاہدے کی تردید کر سکے؟ (جاری ہے)

محمد قاسم (نوری)

بابری مسجد

○

دوستو! بابری مسجد کا ہی ماتم نہ کرو
ہر طرف سینکڑوں گرتے ہوئے منبر دیکھو

○

وہ دبے پاؤں بڑھے آتے ہیں کُلہاڑے لئے
بیتِ اقدس کو، یہودی ہیں گرانے والے
پانچ سو مسجدیں فریاد کناں ہیں اب تک!
بُوسنیا، میں، جنھیں ڈھاتے رہے ڈھانے والے
سات سو مسجدیں 'اسپین' میں تہہ تیغ ہوئیں
اور مُنہ دیکھا کئے سارے زمانے والے
مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ نے کیا کچھ نہ کیا
پھر بھی گُن، اُس کے گاتے رہے، گانے والے
چشمِ قرآں سے ٹپکتا رہا ہر روز لہو
اور خاموش رہے، شور مچانے والے
مُتّحد کُفر ہُوا، دیں کو مٹانے کے لئے
سب کہاں کھو گئے وہ، دیں کے بچانے والے

○

بات مسجد کی نہیں؛ جذبۂ ایماں کی کرو
اُمّتِ واحدہ بن کر جیو، قرآں کی کرو
دوستو! بابری مسجد کا ہی ماتم نہ کرو

پُرانے بادہ خوار تھے جتنے سب اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

یہ دنیا فانی ہے، بقائے دوام کے نصیب، سبھی نے اپنی باری پہ یہاں سے چلے جانا ہے مگر جب کوئی پرانا ساتھی، کوئی بزرگ اس جہانِ فانی سے ابدی دنیا کی طرف جاتا ہے تو وہ اپنے پیچھے ایک دَور کی یادیں چھوڑ کر جاتا ہے، ایک دَور کی تاریخ کا ایک باب بند کر جاتا ہے۔

پرویزؒ صاحب کے چند پرانے ساتھیوں نے جس خلوص اور پامردی سے ان کا تحریکِ پاکستان کی جدّوجہد میں عملی طور پر ساتھ دیا، ہر قسم کی مخالفت، دشنام طرازی اور کافرگری کے باوجود ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی، جس طرح سے وہ طلوعِ اسلام اور مجلّہ طلوعِ اسلام کی نشر و اشاعت میں شریک ہوئے وہ بذاتِ خود ایک داستان ہیں عزم کی، ثبات کی، وفاداری کی، اپنے مقصد سے لگن اور اس کے لئے قربانیاں دینے کی۔

خلیل صاحب ــــ میرزا محمد خلیل صاحب، اس گروہِ عاشقانِ قرآنِ پاک میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ پرویزؒ صاحب کے شملہ اور دہلی کے زمانے کے پرانے رفیق تھے، اس زمانے کے رفیقوں میں ایک تو شیخ سراج الحق تھے جن سے قلبی تعلق اور جن کے بچھڑ جانے کے دکھ کا اظہار پرویزؒ صاحب مختصراً اپنے اس نوحے میں کر چکے ہیں جو طلوعِ اسلام جولائی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شامل ہے، ــــ انور صاحب تھے جو چند سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے، ایک خلیل صاحب رہ گئے تھے ــــ وہ بھی ۱۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے حیاتِ اُخروی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

ہاں واقعی وہ ایک شمع اور قندیل تو تھے ہی مگر روشنی کے ساتھ ساتھ خوش نوائی کے باعث بھی گرمیٔ محفل کا سامان کرتے تھے، ــــ طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن کے موقع پر یا طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام کسی اور محفل میں تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد کلامِ اقبالؒ کی نغمہ سرائی کے لئے خلیل صاحب ہی کو پکارا جاتا اور دھان پان سے خلیل

صاحب ـــــ لاپھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی، ترنم سے سُنا کر سماں باندھ دیتے ـــــ اور جب وہ اس شعر پہ آتے،

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

تو پرویزؒ صاحب معنی خیز تبسم کے ساتھ شیخ سراج الحق کی طرف متوجہ ہوتے اور شیخ صاحب جواباً سر جھکا کر مسکرا دیتے۔

شیخ صاحب اللہ کو پیارے ہوئے، تو ابھی مینائے غزل میں ذرا سی باقی تھی وہ خلیل صاحب کے حصّے میں آئی جو بس چند ہی سال چل سکی، اب اقبالؒ کی مینائے غزل سے لطف اندوز ہونے والا اور کرنے والا کہاں سے آئیگا، یہ شمع فروزاں اب واقعی خاموش ہے، اب عزم و ہمت کا وہ پیکر کہاں جو ماہ و سال کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، پیرانہ سالی کے باوجود، محض اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور طلوعِ اسلام کی خدمت میں مصروف رہا ـــ وہ فروری ۶۷ء سے دسمبر ۸۸ء تک طلوعِ اسلام کے ایڈیٹر اور ادارۂ طلوعِ اسلام کے ناظم کے فرائض انجام دیتے رہے اور بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

ایک ستارۂ خدمت تو حکومتِ پاکستان نے انھیں سرکاری خدمات میں دیانت اور حسنِ کارکردگی کی وجہ سے دیا تھا ـــ آج بے حساب نیکیوں کے خوشبودار پھول دامن میں سمیٹے سفرِ آخرت پہ رواں ہیں تو ہم سرمژگان چمکتے ہوئے ستارے ان کو ہدیہ کے طور پر نذر کرتے ہیں۔

شاید بہت کم احباب کو معلوم ہوگا کہ ۲۵۔بی گلبرگ، جہاں پرویز صاحب بادہ کشاں محفلِ قرآنی میں علم و بصیرت کے جام بانٹتے رہے، خلیل صاحب کے نام پر الاٹ تھا، پرویز صاحب کا اپنا پلاٹ بڑی سڑک سے ہٹ کر، پچھواڑے میں تھا، طلوعِ اسلام کے درس کی اہمیت کے پیشِ نظر خلیل صاحب نے بطیبِ خاطر یہ جگہ پرویز صاحب کی نذر کی اور خود دوسرے پلاٹ تک پیچھے ہٹ گئے۔

۸۹ء میں اپنے بیٹوں کے پاس امریکہ چلے گئے ـــ طلوعِ اسلام کی حرارتوں سے محرومی اور امریکہ و کینیڈا کی سردی نے ان کے نحیف جسم اور گرتی ہوئی صحت کو ڈھا دیا، پچھلے سال واپس آئے تو بس ریت کی دیوار تھے جو آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتی ہوئی آخر بکھر گئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

- غیر ممالک میں مقیم پاکستانی افسر شاہی کی زد میں۔
- ویزا قوانین سے کہیں زیادہ سنگین مسئلہ۔
- حکومتِ پاکستان کی پیدا کردہ اندھیر نگری۔
- پاکستانیوں کو اپنے ہی وطن میں غیر ملکی قرار دے دیا گیا۔

مکتوب از ناروے

تقریباً بیس سال بیشتر جب پاکستانی نوجوان اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی غرض سے روزگار کی تلاش میں اپنے ہی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر ممالک میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد پاکستان کے حکومتی ادارے انہیں حلال روزی کمانے کے جرم میں بے وطن اور بے گھر قرار دے دیں گے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہر محبِ وطن پاکستانی کی تحقیر و تذلیل کی انتہا ہے جس کی مثال کہیں دُور دُور تک نہیں ملتی۔

کیا کوئی پاکستانی تصور بھی کر سکتا ہے کہ وہ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر قائم کئے گئے علامہ اقبالؒ اور حضرت قائداعظمؒ کے پاکستان سے جو اس کی دینی اور ملی شناخت و تشخص ہے، سے صرف اس لئے دستبردار ہو جائیگا کہ اس نے محض چند ٹیکنیکی مشکلات و مسائل اور ٹیکنیکی تحفظ کے پیشِ نظر کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لی ہے جبکہ اسے ہر مرتبہ ذمہ دار حلقوں کی طرف سے یقین دہانی کرائی جاتی رہی کہ اس کی پاکستانی شہریت اور پیدائشی حقوق کسی صورت متاثر نہیں ہوں گے لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ آج صورتِ حال کیا دکھائی جا رہی ہے۔ دیکھئے (حکومتِ پاکستان کی طرف سے متعلقہ پریس ریلیز مؤرخہ ۲۸ مارچ ۱۹۹۲ء، زیر آرڈر ۹ ستمبر ۸۴ء) جس کے تحت غیر ملکی شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کو کسی بھی دوسرے غیر ملکی کی طرح پاکستان میں جائیداد کی خرید کے لئے حکومت سے اجازت لینے کا پابند کر دیا گیا ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کل اور آج کے اُن حکومتی ذمہ دار حلقوں اور اُن معتبر ذہنوں سے کہ کیا حلال روزی کے لئے ہماری محنت و مشقت اور اپنے وطن سے محبت و لگن کوئی جرم تھا کہ جس کی ہمیں اتنی بڑی سزا دی جا رہی ہے ؟؟؟

ہم جو یہاں برسوں سے اپنی دینی حمیت و غیرت، وطنی ثقافت و روایات اور قومی زبان و اذہان کے لئے سر توڑ جدّوجہد کرتے چلے آ رہے ہیں، کیا اس کا ہمیں یہ صلہ دیا جانا مقصود تھا کہ اپنے ہی گھر والے آج ہمیں سرکاری اور تحریری طور پر ایک عام غیر ملکی (FOREIGNER) تصور کرتے ہوئے جسدِ وطن سے کاٹ کر الگ پھینک دیں ؟؟؟

(میں لکھتا ہوں تو پڑھتا جا اور پڑھ پڑھ کر شرماتا جا میں روتا ہوں تو ہنستا جا اور ہنس ہنس کر شرماتا جا)

اے ملک و ملت کے پاسبانو! مملکتِ خداداد کے ٹھیکیدارو، خلقِ خدا کو پابندِ سلاسل کرنے والو! اس ایک نقطہ پر ہی غور و فکر کرو ـــــ کہ ایک وہ یہودی جو اس کرۂ ارض کے کسی بھی گوشہ میں مقیم ہے وہ جب چاہے اسرائیل میں بغیر ویزا داخل ہی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ مستقل سکونت اختیار کر سکتا ہے جس کے حقوق میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جاتی حالانکہ پیدائش کے اعتبار سے وہ اسرائیلی بھی نہیں ہوتا۔ بس اسی ایک نقطہ کی روشنی میں ذرا غور فرمایئے گا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں یا حکومتِ پاکستان نے ہمیں کہاں لاکھڑا کیا ہے کہ دیارِ غیر میں بیس سال گزارنے اور مقامی شہریت حاصل کرنے کے باوجود یہاں بھی ہمیں غیر ملکی ہی تصور کیا جاتا ہے اور پھر انتہا تو یہ ہے کہ اب ہمیں اپنے ہی ملک میں سرکاری طور پر ایک اجنبی، غیر ملکی کہا جانے لگا ہے۔ شاید ایسے ہی مقام پر پہنچ کر کسی دل جلے نے کہا ہوگا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ہمارے فکر و تدبر کے نتیجہ میں حکومتِ پاکستان کا استحکام اور ملتِ پاکستانیہ کا مفاد اسی میں ہے کہ حکومت تارکینِ وطن کو قانونی طور پر پاکستانی تسلیم کرتے ہوئے ہر ممکنہ سہولت مہیا کرے تاکہ علاوہ دیگر تمام شہری حقوق کے ساتھ پاکستان میں پورے اطمینان اور ملی جذبہ کے ساتھ سرمایہ کاری کر سکیں اور پاکستانی معیشت میں اپنا رول اور ملی فریضہ ادا کر سکیں۔ جب تک تارکینِ وطن کو قانونی تحفظ نہیں دیا جاتا یہ پاکستانی مسلسل تذبذب کا شکار رہیں گے بلکہ غیر ممالک میں سرمایہ کاری پر مجبور ہوں گے ـــــ ہم پوچھتے ہیں وطن کے ان پاسبانوں سے کہ وہ کس سوچ اور کس قانون کی بناء پر یہ اعلان اور فتویٰ صادر کر بیٹھے ہیں کہ ہم پاکستانی اپنی پاکستانی شہریت یا جذبۂ حب الوطنی سے سبکدوش ہونے کا تصور بھی کر سکتے ہیں چہ جائیکہ ہم یہ اعلان سُن کر تسلیم کر لیں گے۔ کیا ہمارے دینی و ملی جذبہ کو محض کاغذ پر لکھی گئی چند سطور کے عوض اس قدر آسانی کے ساتھ نیلام کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ پاکستانی شہریت محض CITIZEN-SHIP نہیں بلکہ یہ ہمارے ایمان و ایقان کی شرط اور تقاضا ہے جسے اس طرح چند نام نہاد آرڈرز کے تحت دبایا جا سکتا ہے نہ لٹایا جا سکتا ہے، ہم اس کے تحفظ کے لئے تاحیات سر توڑ کوشش کرتے رہیں گے اور اپنا دینی و ملی تشخص محفوظ کرنے کے لئے ہم قانونی چارہ جوئی کے لئے بھی کوشش کر رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اگر غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں (مقامی شہریت کے حامل) کو ویزا سے استثناء (EXCEPTION) اور پاکستان میں پولیس رجسٹریشن سے متعلقہ فارن آرڈرز سے استثنائی سہولت دے دی گئی ہے تو مذکورہ متنازعہ فارن آرڈر جاری کردہ ۹ ستمبر ۸۴ء سے استثنا کیوں نہیں دی گئی یا دی جا سکتی، یا للعجب!

یاد رہے کہ ہم پاکستانی عرصہ دراز سے یہ مطالبہ اور خواہش کر رہے ہیں اور جس کی پذیرائی کے لئے ماضی میں متعدد مقتدر شخصیات نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ایسے پاکستانیوں کو جو دیارِ غیر میں مجبوراً متعلقہ غیر ملک کی شہریت اختیار کر چکے ہیں، ایک ایسا متبادل کارڈ جاری کر دیا جائے گا جس کی اہمیت و حیثیت پاکستانی شہریت کے برابر ہوگی۔ ہم نے اس

مذکورہ کارڈ کو "جناح کارڈ" کا نام دیا تھا اور آج بھی ہم اس مجوزہ کارڈ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح ہمارے جذبۂ حب الوطنی کی بھرپور عکاسی و غمازی کرتی ہے۔ یہ ایمان کی دولت ہے لٹائی نہیں جا سکتی۔ ہم اپنے وطن کے اور دیگر بیرونِ ملک مقیم پاکستانی اربابِ فکر و نظر، اہل قلم اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار قانون دان حضرات سے پُرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ اس ظلمِ ناروا اور ملّی بے حسی کے مرتکب ذہنوں کے خلاف ہمارے ساتھ اس جدوجہد میں ہمارا ہاتھ بٹائیں تاکہ دیارِ غیر میں بسنے والے لاکھوں پاکستانی اس ظلم و زیادتی سے چھٹکارا حاصل کر سکیں اور ان کی آنے والی نسلیں سکون اور اطمینان سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ بچے خطۂ پاکستان سے ہی نہیں، اسلام سے بھی لاتعلق رہ جائیں گے اور یہ ایک عظیم قومی المیہ ہوگا جس کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر رہے۔ آمین۔

سیکرٹری جنرل

بزمِ طلوعِ اسلام، اوسلو۔ ناروے

معذرت

جنوری ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں علّامہ غلام احمد پرویزؒ کا طویل مضمون ــــ "فنڈامینٹل ازم" ــــ شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر اس مضمون کو مؤخر کر کے اس کی جگہ پرویزؒ صاحب کا مضمون "ہندو کیا ہے" شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

Embassy of Pakistan
Oslo

28 March, 1992

Subject: Purchase/sale of property in Pakistan by a Norwegian National of Pakistan origin.

Please refer to our endorsement of even number dated 18 December, 1991, on the above subject.

2. A Norwegian national of Pakistani origin having lost his Pakistan nationality is just another foreigner who shall be governed under the Foreigners Act 1946 for sale and purchase of property in Pakistan. Under Order No.18/153/84-PolIE(II), dated 9th September, 1984 issued by the Government of Pakistan under section 3 of the said Act, no foreigner shall directly or indirectly acquire land or any interest in land or landed property in Pakistan except with the previous permission in writing of the Federal Government or of the Provincial Government where the property is situated and subject to the conditions qualifying such permission.

2. As for inheritance, it would seem to fall outside the purview of the Order aforesaid as inheriting is not "acquiring" within the meaning of the Order; it being only a 'devolution' which as regards a Muslim is an incident of Mohammadan law. Similarly, there is no provision regulating sale by foreigner of property in Pakistan.

Yours sincerely,

(Khizar Hayat Khan Niazi)
Charge d'Affaires

Copy for information to all the editors of ethnic media in Norway. They may like to publicise it for the benefit of our community in this country.

(Khizar Hayat Khan Niazi)

ملک حنیف وجدانی

سانحۂ بابری مسجد!

(ایک ہو جانے کا وقت)

آ گیا عزم و عمل کی شان دکھلانے کا وقت
سومناتی قوتِ باطل سے ٹکرانے کا وقت
پھر ضمیرِ مردِ مومن کو جگانے کے لئے
جرمِ ناداں پر ملا ہے ایک ہو جانے کا وقت
بوڑھوں بچوں عورتوں سارے جوانوں کو سلام
"وحدتِ ملت" ہماری ہے ابھر آنے کا وقت
بابری مسجد! نشانِ عظمتِ ماضی تیرا
اشک افشانی میں لے آیا ہے بہہ جانے کا وقت
تھا جنوں فتنہ ساماں جس قدر ہندو کے پاس
اس کی عیاری کا تھا ظاہر تیرے ڈھانے کا وقت
خُبثِ باطن کر گیا اقوامِ عالم پر عیاں
دہر میں ہندو پہ ہے لعنت کے برسانے کا وقت
رنگ و روپِ سیکولر میں جو فریبی پاپ ہیں
آ گیا پردہ دری سے ان کو دکھلانے کا وقت
ہم کوئی مندر گرائیں یہ نہیں حکمت کی بات
"چھوڑ دو بھارت کی صنعت" سب کو فرمانے کا وقت
اے خدا کعبہ و مسجد اور محمدؐ کے طفیل
جلد تر آ جائے اب رحمت کے برسانے کا وقت

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

زیب و زینت

۵

وضع قطع انسان کو اپنی وضع قطع ایسی رکھنی چاہیئے جو اپنے آپ کو اور دوسروں کو خوشنما نظر آئے۔ اسلام میں زیب و زینت کی چیزوں کا استعمال منع نہیں ہے۔

مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ..... ۝ (۷/۳۲)

"اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو زیب و زینت کی چیزیں پیدا کی ہیں انہیں کون حرام قرار دے سکتا ہے"؟

لباس لباس کا ضروری مقصد تو یہی ہے کہ اس سے انسان کی ستر پوشی ہو اور وہ سردی گرمی سے محفوظ رہے۔ لیکن اس کی وضع قطع بھی دیدہ زیب ہونی چاہیئے۔

قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ (۷/۲۶)

"ہم نے تمہارے لئے لباس بنایا ہے جو تمہاری ستر پوشی کرتا ہے اور زینت و آرائش کا موجب ہے"۔

حسن اور زیبائش دنیا کی ہر شے میں تناسب اور حسن ہے۔

(تناسب کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی ہونی چاہیئے اتنی ہی ہو۔ مثلاً کھانے میں جس قدر نمک ہونا چاہیئے اتنا ہی ہو، نہ کم نہ زیادہ۔ اسی کو حُسن کہتے ہیں۔ (یعنی عمدہ اور اچھا ہونا)۔

اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲/۷)

"خدا نے ہر شے کو بہترین حسن و تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔"

اس لئے انسان کے ہر انداز میں بھی حُسن اور تناسب ہونا چاہیئے۔ صاف ستھرا اور صحت مند جسم، دیدہ زیب لباس (لیکن فضول خرچی سے بنایا ہوا نہیں) پسندیدہ عادتیں اور دل کش نیک آرزوئیں۔ غرضیکہ اِس کی اِس دنیا کی زندگی بھی خوشگوار اور حسین ہونی چاہیئے اور آخرت کی زندگی بھی۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ (۲/۲۰۱)

"(اے ہمارے پروردگار) ہماری اس دنیا کی زندگی بھی حسین و خوشگوار بنا دے اور آخرت کی زندگی بھی حسین و خوشگوار۔"

(نوٹ)

اپنی وضع قطع خراب رکھنا، شکل وصورت بدنما بنائے رکھنا، اچھی بات نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ انسان ہر وقت بننے سنورنے میں لگا رہے اور فیشن کی دُھن اس کے اعصاب پر سوار رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سو سوالوں کا ایک جواب

گذشتہ چوالیس سالوں میں نظریۂ پاکستان اور اسلامی نظام کے الفاظ لاکھوں کروڑوں مرتبہ دہرائے گئے لیکن کسی نے یہ نہیں بتایا کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے اور کسی نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار پانے کا معیار کیا۔ یہ تصورات اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیش کردہ تھے اور انہوں نے ان کا مفہوم اور مطلوب نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔ ایک حصہ لا ــ کہ کیا چھوڑنا چاہیئے اور دوسرا حصہ الا ــ کہ کیا اختیار کرنا چاہیئے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:۔

"تمہارے دین کی یہ بلند فطری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات اور جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں .... کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔ (خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء)

اور حصہ الا کے متعلق قائداعظمؒ نے ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) میں طلبا کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:۔

"اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ لا اور الا مل کر نظریۂ پاکستان بن جاتے ہیں اور یہی اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ کچھ اور شامل کر دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا..... (۱۸/۲۶) وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، پیش آمدہ معاملات باہمی مشاورت سے حل تلاش کرنا، اسلامی نظام ہے۔

جو لوگ قائداعظمؒ اور اقبالؒ کے نقوشِ قدم پر چلنے کی تلقین کریں ان سے کہیئے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نقوشِ قدم پر آپ کس حد تک ان کی پیروی کر رہے ہیں جو دوسروں کو ان کے اتباع کی تلقین کرتے ہو؟

UNFORGETTABLE

Mirza Muhammad Khalil is no longer with us. He said farewell to the earthly life on Friday, December 11, 1992. It is customary in an obituary to bemoan an irreparable loss to the Nation when such an individual departs. Known or unknown, each human is important for the simple reason that he is human, says the Quran. However the Quran also says that each human being is unique, and it is this uniqueness that becomes attractive to the other human being as one observes and experiences another's individuality.

Perhaps others are more competent and knowledgeable in informing the readers how he helped establish and maintain the Tolu-e-Islam office. The little I know is that he was very thorough, methodical and dedicated in whatever he did, even though he did it slowly - that was his way, slow and thorough, even if it meant working overtime, day after day, year after year. Furthermore his priorities were very clear. All his life he held Tole-e-Islam supreme, at any cost and at any sacrifice. It was his very life essence. Once he was perforce to move away from it physically due to the ageing factor plus other factors if any, his health dwindled away very fast. He could not live without Tolu-e-Islam.

His association with Tole-e-Islam and Allama Parwez as an integral part of Pakistan Movement was rich and long. He, as a member of the Railway Board, and Allama Parwez as an officer in the Home Department shifted from Delhi to Simla, and Simla to Delhi, the two cities that were the hubbub of political activities during the freedom struggle. Often I heard Allama Parwez alluding to some event, some conversation in that context, which we naturally could not share the way they mutually could. Lucky are the people who have "lived' that way, and pitiable are those who miss "living" life or are incapable of launching yet another experience as rich and as meaningful.

I think any comment on Khalil Mirza, will be incomplete without mentioning his clear, loud and resonant voice that communicated Allama Iqbal's poetic message of the Quran during the annual conventions of Tolu-e-Islam. Many of us looked forward to it and have missed it for many years now. It always created an atmosphere conducive to the subsequent proceedings.

Such attachment and sincerity to any mission is not that easy to come by, coupled with perpetual hope and optimism, come what may. May Allah bless him for all the services he rendered to Tolu-e-Islam.
(Shamima Anwar)

BEAUTIES OF LIFE

Islam has not prohibited the use of things of art and beauty and encourages to keep one's self good looking.

> "Say; Who hath forbidden the beautiful (gifts) of Allah which He has produced for His servants." (Al-Quran 7/32)

DRESS -- The necessary object of clothing is to cover your shame, but they must look attractive also:

> " We have bestowed dress upon you, to cover your shame, as well as to be an adornment to you."(Al-Quran 7/26)

BEAUTY AND PROPORTION:- The entire creation of Allah is beautiful and proportionate. Anything that is in proportion displays beauty. Proportion means neither too much, nor too little but just appropriate:

> "He who has made everything, that He has created, most proportionate."(Al-Quran 32/7)

Thus every aspect of human life must be proportionate-- clean and healthy body, good looking (but not extravagant) dress, beauty of character, and virtuous aspirations; so as to make the whole life charming in this world and in the hereafter.

> "Our Rabb ! Gives us beauty and proportion in this life and beauty and proportion in the life hereafter".(Al-Quran 2/201)

It is no good to keep yourself untidy and unattractive but that does not mean that you should waste your time in making yourself gaudy.

اسلامک اسٹیٹ

قرآن کریم نے اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں اس طرح واضح اور بیّن طور پر فرق کر کے بتا دیا ہے کہ اس کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کا ابہام ہو سکتا ہے نہ التباس اس نے کہا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5/44)

"جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب (قرآن کریم) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہوتے ہیں"

قائد اعظمؒ نے اسی حقیقت کو چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا جب کہا کہ:

"اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب متعیّن کرتی ہے"

عصر حاضر کے سیاسی تصوّر کی رُو سے آزاد اور خود مختار ریاست (SOVEREIGN STATE) وہ ہوتی ہے جو اپنے ہر فیصلہ میں کاملةً آزاد ہو اور کوئی اتھارٹی ایسی نہ ہو جو اس پر کسی قسم کی پابندی عاید کر سکے قرآن کی رُو سے، خدا کی کتاب وہ حدود متعیّن کرتی ہے جن کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت آزاد اور خود مختار ہوتی ہے کتاب اللہ کی اسی اتھارٹی کو خدا کی حاکمیّت یا اقتدارِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ خدا کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کے بعد، مملکت کی (SOVEREIGNTY) باقی نہیں رہتی۔ یہ اعتراض غلط نگہی پر مبنی ہے۔ دنیا کی ہر اسٹیٹ دوسری اسٹیٹس کے ساتھ معاملات میں ساورن ہوتی ہے لیکن اپنے آئین کی پابندی اس پر بھی لازم ہوتی ہے۔ اپنے آئین کی پابندی سے اس مملکت کی ساورنٹی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہی کیفیت اسلامک اسٹیٹ کی ہوتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ دنیا کی عام اسٹیٹس اپنے لئے آپ آئین مرتّب کرنے یا اس میں ردّوبدل کرنے کی مجاز ہوتی ہیں لیکن اسلامک اسٹیٹ اپنے آئین کے اصول و حدود خود مرتّب نہیں کر سکتی۔ یہ خدا کی طرف سے متعیّن کردہ ہیں۔ جن سے نہ اسلامک اسٹیٹ انحراف کر سکتی ہے نہ ان میں تغیّر و تبدّل۔ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے یہ اسٹیٹ اپنے داخلی معاملات میں بھی ساورن ہوتی ہے اور خارجی معاملات میں بھی ساورن۔ یاد رکھئے! اسیکولر اسٹیٹ سے مراد ہوتی ہے وہ مملکت جس کے حدودِ اختیارات پر کسی قسم کا کنٹرول نہ ہو۔ یہ اصطلاح اسلامک اسٹیٹ کی ضد ہے اس اصطلاح کو اپنے ہاں اختیار کر کے یہ کہنا کہ یہ اسلام کے منافی نہیں یا خود فریبی ہے یا فریب دہی۔

26. And yet these "ulamas" claim that they, all of them whether self-proclaimed or otherwise are the direct successors of the Prophet. And just as the teachings of the Prophet may not be disputed, their teachings and interpretations of the religion may also not be disputed. They have gone so far as to say that any teachings coming from any other source. including the parents of the children, are the teachings of Satan.

27. There should be no priests in Islam no interlocutor between the faithful and Allah S.W.T , but there is now effectively a priesthood which has arrogated to themselves irrespective of their qualification, the role of sole interpreters of Islam who demand obeisance to themselves. As they are human and can go wrong as well as being influenced by certain interests, many of them have caused confusion and deviation which do much harm to Islam and Muslims.

28. It is in this kind of Muslim world that you as thinkers are required to think, to examine Islamic thought and civilization. You are chosen not to disturb the status quo, to avoid controversy, to play safe. But if you do that, you cannot be doing any thinking and cannot be called thinkers. Only if you choose to think, to enquire, to acknowledge the miserable state of the Muslims and Islam, to reason and to criticize the accepted interpretation of the religion, to debunk and to reach conclusion which in the context of present practice may sound radical or even heretical and to declare your stand, only then would you have justified the role that you and the institute are required to play.

29. I would like to warn you that if you dare to be honest, you will be charged with being heretical, by those who have accepted the present teachings and practices. This is a risk you must take. The risk is far less than that taken by the Prophet when he undertook to preach Islam. Of course you are ordinary mortals and can be wrong. Nor will you have the protection accorded by Allah S.W.T. to the Prophet, But the deviation in the teachings of Islam and the end plight of Islam and the Muslims resulting from some of the present interpretations and teachings require that someone accept the risk, someone committed enough to Islam to set aside personal considerations.

30. Inshallah, Guidance will be given to you in the task that you face. I and many concerned Muslim will be praying for you.

With their hope and prayers I now officially open the Institute of Islamic Thought and Civilisation.
Wassalamualaikum warahmutullahi Wabaraka

Different groups of Muslims emerged who believed and worshipped in different ways. The shiahs, the Sunnis, the Khawarij and Druzus and numerous divisions appeared in the Muslim world only to be divided further by the interpretations of different imams from each group at different times. Numerous "Tarikats" appeared which preach practices which are questionable and differ radically with each other. The interpretations, teachings and "ijtihads" have divided up not just the Muslims but Islam itself as a religion. Islam has become many religions with many different practices and beliefs.

23. It was thought that the solution to further fragmentation and deviation was to stop "ijtihad" altogether. Henceforth, no one was to think or discuss Islam but to accept previous interpretations as dogmas without question. But this decision by some "ulama" learned and well-intended though they may be, did not resolve the problem of the continuing fragmentation of Islam and Muslims. Neither had it solved the problem of wrong teachings and interpretations which had created numerous groups of deviates. Certainly new problems in a changing world cannot be resolved.

24. Many of the teachings and interpretations of Islam as made by some of the "ulamas" and believed to be sacrosanct are clearly damaging to Islam and the Muslims. The state of the Muslim world to day is the result of these tendentious interpretations. In the early years of Islam, the religion was acknowledged by all, the Muslims and the non-Muslims, as a great religion which converted the nomadic jahilliah Arabs into a great people with achievements not only in the spread of the teachings of Islam but in all fields of knowledge, the arts, the sciences, medicine, astronomy, etc. In other words, Islam converted a backward people into the founders of the greatest civilisation of all times.

25. If to-day Islam and the Muslims are reduced to depending on others for their skills and knowledge and even for their own defences. if today Muslims are forced to grovel at the feet of their enemies, helpless even to resolve the problem of the Zionists, it is not because of Islam but the interpretations of Islam by the frequently self-styled "ulamas" who emerged after the golden days of Islamic glory. It is these "ulamas" with their rigidity, their belief that this world is not for the Muslims, that the most important expression of "Imam" is continuous rituals of obeisance to Allah, that what is sunnat and therefore is optional must be considered as wajib or compulsory. it is these people who have reduced Islam and the Muslims to the inferior status that they are now. Before the interpretations and teachings of these "ulamas" the Muslims were the most successful people in the world who spread the teachings of Islam , built a huge Islamic empire and created the Islamic Civilisation.

18. The Al-Quran is complete and covers every aspect of life. It ves guidance to the faithful. Through it the followers will know the rrect direction and approach to solving worldly problems and mastering allenges. But this does not mean that the Quran will provide detailed nswers to every question faced by everyone. Nor is the Quran meant to e the sole source of all knowledge, It enjoins the followers to seek owledge. knowing the contents of the Quran alone would not, for xample, make a man a capable defender of the faith. To defend the faith, e must know the art of war, the weapons, the skills, the technology, etc, hich he must learn elsewhere. The Quran directs him to equip himself ith swords and horses i.e the weapons of defence at the time. Clearly it ould be futile in this day and age to depend on swords and horses.

19. When the followers find themselves lost, i.e unable to resolve eir problems they must refer to the Al-Quran for guidance. Guidance oes not infer minute and detailed instructions as to exactly what to do Guidance infers direction, the right approach, the right path. Knowing the irection, the faithful must apply their minds and think and resolve their roblems according to knowledge, reason and logic, A Muslim may pray or guidance but he must also think and act in order to resolve the roblem before him. To pray and leave everything to Allah S.W.T is not he way of Islam. To say that the failures had been pre-ordained when the Muslims make no effort to achieve success in to put the blame of Allah S.W.T. And this, no true Muslims should do.

20. For many centuries after the death of the Prophet, Guidance was sought from those close to him, i.e. the companions and the narrators of impeccable character, But with the passage of time and in the absence of specific Sunnah and Hadith, many questions of religion had to be determined through "ijtihad". The learned theologians had to apply their minds, after referring to the Al-Quran, the Hadith and the Sunnah for guidance, in order to resolve an issue, The "fatwa" that they make is the result of their thinking, and constitutes a part of religious belief by those who subscribe to the teachings of these particular theologians or "ulamas". Others will dispute the conclusion arrived at by this group and believe in the conclusions and "Fatwa" of other groups which may differ considerably.

21. Since it is seldom that two persons or groups will agree mpletely on any matter, the "ijtihad" often leads to differing and nflicting fatwas. To complicate matters there were scholars and venders who allowed their own vested interests or those of their ons to influence their thinking.

22. As a result, the single religion of Islam that was brought by the phet acquired different and frequently conflicting interpretations.

11. Islam did not come into this world in a vacuum. It came at a time of ignorance, in the days of the jahilliah, It came to enlighten, i.e. it came with a reason, Islam came to light the way for the jahilliah in Mecca and for the rest of humanity.

12. The enlightenment was needed for the jahilliah who were among the most cruel and unprincipled people in the world of that time, They were given to females infanticide, to regarding women as mere chattels, to slavery and the extreme cruelty to slaves, to endless feuds and tribal wars, to human sacrifices and the worship of stone images, to no extreme fondness for praise, to avarice and to a whole series of other qualities which render them almost unfit to be considered as human.

13. At the same time the practice of the other religious of Allah S.W.T which were taught by the prophets before Muhammad, S.A.W had, deviated from the original teachings. Many had gone back to idol worship and to the practices which brought misery to their community. Priests had taken over the religions and placed themselves not just as the interpreters of the religions but as the intermediaries between God and the faithful.

14. This was the world to which Islam came, This was the world and the time when Muhammad, S.A.W received his first message from Allah S.W.T and the message were all meant to restore faith in Allah and to create a better Society, indeed a better and more human civilization.

15. Islam came to show the way of life for the whole human race then and in the future. More than any other religion, Islam was not to be just a way of worshipping Allah S.W.T., of prayers and rituals. Islam was meant to reshape the value system of the faithful and the whole human race and to instruct society on how to conduct its affairs, its administration, its laws and its academic and social life,

16. From the very beginning and throughout its teachings, Islam emphasized the need to acquire knowledge, to understand and appreciate the wonders created by Allah S.W.T.,and therefore, to think. Obviously Islam is not just a faith but it relates to everyday life, explains it and gives guidance as to how to relate to it for success in this world and a better life in the hereafter.

17. Change was predicted for the future, the accuracy of which in truly amazing, Human society was not expected to be static but would be in a constant state of flux. And all these would not be without reason. And the followers of Islam must obviously change and adjust to new situations for their continued success.

civilisation is therefore, not a civilisation of unquestioning faith alone but a civilisation of thoughts and ideas based on the teachings of Islam.

6. If this Institute is to be worthy of its name then it must examine the religion of Islam as we find to-day in order to find the rationale for the multitude of rituals and practices, the interpretations of the Al- Quran, the Hadith and the Sunnah, which together make Islam not just a faith but also a way of life, i.e, as Addin, If this Institute and those who participate in its activities are merely to seek or devise explanations for each and every practice, some of which as presently practised are incompatible with each other and are probably wrong and un-Islamic, or if it is to try only to find a way out for the Muslims in a world that is no longer the same as that at the time of the Prophet, S.A.W., if it is to devote entirely to finding excuses for the obvious failures of the Muslim and their practice of Islam and to explain everything by speaking of rewards in the afterlife, then the institute would not be an Institute for thinking but would be merely for apologizing for Islam. And this is an unnecessary exercise, for Islam needs no apology.

7. As to Islamic Civilisation, are we referring to the Golden Age of Islam in the past or the present day Islamic world? some may define Islamic Civilisation by the piety of the Muslims in the performance of rituals and not their worldly achievements. Other might think purely of their worldly achievements. If we do not define what we mean by Islamic Civilisation, we may end up discussing different things and so fail to achieve any sensible assessments or direction. In other words, we would be indulging in a futile exercise and would not contribute anything to Islam or the Muslims.

8. To be worthy of the title, the institute must be prepared to analyse and to reason and to find reasons, not for the principle articles of faith, such as the bearing of witness to the oneness of Allah S.W.T and that Muhammad S.A.W is His messenger, but for those other practices, rituals and values which make Islam a way of life.

9. yet when this is attempted, the Institute is going to come in for such criticism and probably be accused of hearsay by those who feel that no reason is required, that all matters concerning Islam are articles of faith and faith alone. Even more vehement will be the criticism of those who interpret Islam as living in the 7th century.

10. The detractors of this Institute will have no such attributes of being merciful or compassionate, They will be even less merciful and compassionate when the thinking of this Institute clashes with their interpretations and undermine the hold they now have over the Muslim community through their teachings.

INSTITUTE OF ISLAMIC THOUGHT AND CIVILISATION IN KUALA LUMPUR

Following is the text of speech delivered by the Prime Minister Yab Dato Seri Dr. Mahathir Bin Muhammad at the official opening of the International Institute of Islamic Thought and Civilisation (ISTAC) Jalan Damansara, Kuala Lumpur, on Friday, 4th October 1991. The photocopy of the text was given to me by a friend of mine. Readers of Tolu-e-Islam will appreciate that the rays of Allama Ghulam Ahmed Parwez's research and re-evaluation of traditional Islam in the light of the Quran has penetrated even in the corridors of power. This indeed is a welcome augury for times to come. (Abdullah Sani)

In the name of Allah the compassionate, the Merciful.

2. Thus do we Muslim begin everything, for we do nothing except in the name of Allah, the compassionate and the Merciful.

3. Of the 99 attributes of Allah S.W.T being compassionate and merciful are the two most often repeated by us. They surely must be the most important attributes of the only God that we worship, Allah S.W.T.

4. Yet; These two attributes are least common among men, the Muslims included. We are not merciful nor are we given to much compassion, especially to those who are in our estimation may have done wrong, particularly in the interpretations of our religion. As the Christians of old excommunicated, so do Muslims readily condemn other Muslims as heretics for the slightest differences of opinion or for questioning established dogma.

5. It is for this reason that I consider the founding of this institute of Islamic thought and civilization a brave enterprise. Faith and thoughts do not often go together. Indeed faith implies blind unquestioning submission. On the other hand, thinking requires reason and logic, a process of analysis, enquiry and questioning which are certainly at odds with complete submission, i.e , with faith . On the other hand a non-thinking society can create no civilisation; Islamic civilisation is not the result of pure rituals of obeisance to Allah but was developed thoug thinking and applying the injunctions and guidance of Allah S.W.T as way of life. An unthinking society cannot establish a civilisation. Islam

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r)
NO RESERVATION REQUIRED
ALL THOSE INTERESTED IN THE TEACHINGS OF QURAN ARE CORDIALLY INVITED.

1. BIRMINGHAM. 229 Alum Rock Road	Sunday 3 PM
2. CANADA 716 The West Mall, Etobicock, ONT Phone (416)245-5322 or(416)620-4471	1st Sunday 11 AM
3. DENMARK R.O.Aegte Taepper, Falkoner Aue 79 2000 Fredriksberg C.	Last Sat **2 PM**
4. KUWAIT Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain Phone 5316273	Friday 5PM
5. LONDON 76 Park Road Ilford Essex Phone 081-553-1896	1st Sunday 2.30 PM
6. **NORWAY** Akeberg Veien-56 -Oslo-6 Galgeberg, 4th floor	1st Sunday 4PM
7. YARDLEY 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM.

TOLU-E-ISLAM MAGAZINE AND PUBLICATIONS OF ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ(r) ARE ALSO AVAILABLE AT THE ABOVE PLACES